غالب شناسی
اور
نخلستانِ ادب
تلاش و ترتیب
ڈاکٹر طاہر تونسوی

غالب شناسی اور نخلستانِ ادب

تلاش و ترتیب

ڈاکٹر طاہر تونسوی

مکتبہ الہام ۳۴۔سی ماڈل ٹاؤن (اے) بہاول پور

ضابطہ

نام کتاب: غالب شناسی اور نخلستان ادب

کمپوزنگ: محمد اورنگ زیب ظفر (بہاول پور)

اشاعت: ۲۰۰۶ء

تعداد: ۵۰۰

پریس: جویریہ پرنٹنگ پریس ملتان

قیمت: ۱۵۰/۰۰ روپے

انتساب

نخلستانِ ادب (بہار ۱۹۳۵ء) کے مدیر

پیرزادہ احمد شاہ

کے نام

جو بعد میں

احمد ندیم قاسمی کے حوالے سے ادبی لیجنڈ قرار پائے

ترتیب

صفحہ نمبر

مضامین:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج بہاول پور (ایس۔ای کالج) کا شمار ملک کے قدیم ترین اداروں میں ہوتا ہے اس خطے میں یہ پہلا کالج ہے جو ۱۸۸۶ء میں قائم کیا گیا اور اس کا کریڈٹ نواب آف بہاول پور ہز ہائی نس محمد صادق خاں عباسی کو جاتا ہے اس سے قبل پنجاب میں گورنمنٹ کالج لاہور اور ایف سی کالج لاہور کا قیام عمل میں آچکا تھا مگر ان کالجوں میں فیسوں کا جو معیار تھا وہ عام اور غریب طالب علموں کے بس سے باہر تھا اس لیے ملتان، ڈیرہ غازی خان کے علاوہ دیگر شہروں سے طالب علم یہاں داخلہ لیتے تھے (یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ملتان اور ڈیرہ غازی خان میں کوئی کالج نہیں تھا) اور انہیں سستی اور معیاری تعلیم دی جاتی تھی علاوہ ازیں بہت سی رعائتیں اور سہولتیں بھی دی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ غریب طلبہ اس کالج میں داخلہ لینے کو ترجیح دیتے تھے اور یوں بھی اس کا معیارِ تعلیم بھی بہتر تھا اس کی وجہ نواب صاحب کی تعلیم سے دلچسپی بھی تھی اور اس میں کام کرنے والے اساتذہ کی محنت کا بھی دخل تھا اس اعتبار سے اس کالج کا ایک نام تھا اور اب بھی ہے۔

جہاں تک اس کالج کی تاریخ کا تعلق ہے تو اس کا تذکرہ ضروری ہے۔ ۱۹۸۶ء میں جب اس کی صد سالہ یادگاری تقاریب کا انعقاد ہوا تو اس موقع پر دو یادگاری کتابچے شائع کیے گئے جن کا سہرا پروفیسر منور علی خاں اور ان کے احباب کو جاتا ہے ان دونوں کتابچوں سے اس کالج کی تاریخ اور اس کے بارے میں معلومات مل جاتی ہیں البتہ اس میں کمی کا احساس بھی ہوتا ہے کہ بعض باتیں عدم آگاہی کی بنا پر رہ گئی ہیں اور ضرورت اس امر کی ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور کی طرح اس کالج کے بارے میں ایک مکمل تاریخ لکھی جائے اور اسے شائع بھی کیا جائے جو اس کالج کی عظیم الشان روایات کی آئینہ دار ہو اور

کے ریکارڈ کا مطالعہ ضروری ہے مگر افسوس ہے کہ اس طرح کا مکمل ریکارڈ دستیاب نہیں تاہم جو کچھ دستیاب ہے اس کے استعمال سے ایک اچھی دستاویز ترتیب دی جا سکتی ہے اور فاضل اساتذہ اور ریٹائرڈ ماہرین تعلیم پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دے کر اس اہم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکتا ہے بصورتِ دیگر موجود مواد کے ضائع ہونے کا خطرہ موجود ہے۔

یہ تو آئندہ کے لائحہ عمل کی بات ہے البتہ سو سالہ تقریبات کے سلسلے میں اور مختلف رسائل اور اخبارات میں چھپنے والے مضامین و مقالات کی روشنی میں اس کا تاریخی جائزہ اس طرح سے ہے اور یہاں اقتباسات ☆ درج کر کے ایک اجمالی صورت پیش کی جا رہی ہے جس سے ریاست بہاول پور میں تعلیمی ترقی اور مختلف تعلیمی اداروں کے قیام اور ان کی کیفیت کے بارے میں عکاسی کی گئی ہے۔

سر سید احمد خاں نے علی گڑھ تحریک کے ذریعہ برصغیر کے مسلمانوں کو مغربی علوم اور سائنس کی ترویج کی طرف راغب کیا۔ اور ان میں اس بات کا شعور پیدا کیا کہ ان علوم کی تحصیل سے ہی وہ دورِ حاضر میں ترقی کے زینہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ اور اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتے ہیں۔ ایم اے او کالج علی گڑھ کے قیام کے بعد برصغیر میں جگہ جگہ اینگلو اور ینٹیل تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔ خطہ بہاول پور کے عوام و خاص اور بالخصوص والیان ریاست دینی علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر مغربی علوم کے حصول کی اہمیت سے روشناس ہوئے۔ لہٰذا ریاست میں بھی ان علوم وفنون کا چرچا ہوا اور سر رشتہ تعلیم یعنی ریاست کے لیے ایک ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کی باقاعدہ بنیاد رکھی گئی۔ ۲۱ اپریل ۱۸۶۷ء کو کیپٹن منچن کے مشورے پر ملتان کی چرچ مشن سوسائٹی کا ایک پادری ایبٹ صاحب بہاول پور میں ایک انگریزی اسکول کے اجراء کے لیے آیا۔ ۲۴ اپریل ۱۸۶۷ء کو بہاول پور شہر میں کیپٹن منچن کے مشورہ پر ایک اجلاس میں سید مراد علی شاہ نیو

☆ ایس ای کالج کے سو سال (۱۸۸۶ء۔۱۹۸۶ء)

پولیٹیکل ایجنٹ اور دیگر رؤساء شہر شریک ہوئے۔ اور اس اسکول کے لیے ایک کمیٹی غلام رسول خاں کاردار بہاول پور کی سرکردگی میں بنائی گئی۔ جس میں کرم شاہ صاحب' مولوی کالو' پنڈت گنیش داس' مسکی لعل چند' بابو کالی داس چکرورتی ہیڈ ماسٹر اور عبدالرحمن خاں مدرس اول فارسی بحیثیت اراکین شامل تھے۔

۲۶ اپریل ۱۸۶۷ء کو اراکین کمیٹی نے ۱۰۸ طلباء کے داخلہ کی تجویز کی اور انگریزی ، فارسی اور ہندی زبانیں پڑھائے جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ مشن سکول اینگلو ورنا کیولر مڈل تک کی تعلیم کے لیے ملتان چرچ کی زیرنگرانی کیم مئی ۱۸۶۷ء کو جاری ہوا۔ اور پہلے دن ۳۹ طلباء داخل ہوئے۔ یہ تعداد دسمبر ۱۸۶۷ تک ۱۷۶ ہوگئی جس میں انگریزی پڑھنے والے طالب علموں کی تعداد ۵۲ ، فارسی پڑھنے والوں کی تعداد ۷۰ اور ہندی پڑھنے والوں کی تعداد ۵۴ تھی۔ ستمبر ۱۸۶۷ء میں مشن اسکول کے سٹاف میں ایک ہیڈ ماسٹر برائے انگریزی، چار استاد برائے فارسی اور ایک استاد برائے ہندی مقرر کیے گئے تھے۔ تدریس اور جماعت بندی کا انتظام پنجاب گورنمنٹ کی مدارس کے واسطے ہدایات کی روشنی میں کیا گیا۔ اس اسکول کو ریاست کی طرف سے ۲۵۰ روپیہ ماہوار گرانٹ ملتی تھی۔ ۱۸۶۸ء میں میجر منچن نے ریاست میں ۱۸ پرائمری اسکول قائم کیے جس کی تعداد پر ۳۲ ہوگئی۔ ۱۸۷۱ء میں اساتذہ کی تربیت کے لیے بہاول پور شہر میں ایک نارمل اسکول قائم کیا گیا۔ تاکہ جو طلباء اس نارمل اسکول سے فارغ ہوں انہیں پرائمری اسکولوں میں مدرس مقرر کیا جائے۔ اس سکول میں اردو، فارسی اور ریاضی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ایجنسی کے دوران تعلیمی ترقی پر پوری توجہ دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایجنسی کے اختتام اور نواب صادق محمد خاں چہارم کے اختیارات کلی کے حصول کے وقت ریاست میں پرائمری سکولوں کی تعداد ۴۸ ہو گئی تھی۔ ان میں سے ۴۵ مدرسوں میں فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور تین میں ہندی کی۔ ان تمام مدارس میں ۱۳۷۳ طلباء تعلیم پاتے تھے جن میں ۸۸۶ مسلمان تھے اور ۴۸۷ ہندو

تھے۔ان مدارس کا انتظام نواب صاحب کے اتالیق ڈورن کے ہاتھ میں تھا۔

۱۸۷۹ء میں تفویض اختیارات کی رسم ادا کرنے اور نواب صاحب کو ایک بااختیار حکمران کی حیثیت سے مسند نشین کرنے کے لیے سر رابرٹ ایجرٹن گورنر پنجاب بنفسِ نفیس بہاول پور تشریف لائے۔نواب صاحب کے دل میں ریاست میں تعلیم کی اشاعت اور لوگوں کے دلوں کو علم کی روشنی سے منور کرنے کا جذبہ فروزاں تھا۔اس موقع کی رعایت سے اور اظہار تشکر کے جذبے کے ساتھ نواب صاحب نے رابرٹ ایجرٹن کے نام نامی کی یادگار میں ایک ہائی سکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔۱۸۸۲ء میں سر رابرٹ ایجرٹن کی سبکدوشی عمل میں آئی تو اُن کی سبکدوشی پر اظہار افسوس کرنے اور اُنکی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے نواب صاحب نے پرانی کوٹھی میں ۱۳ اپریل ۱۸۸۲ء کو ایک دربار منعقد کیا۔جس میں نواب صاحب نے فرمایا۔

اے صاحبان ہم نے ان (ایجرٹن صاحب) کی دلی محبت کے خیال سے مناسب سمجھا کہ ان کا نام اس ریاست میں ہمیشہ یادرہے اور آپ صاحبان کو ان کی یادگار سے نسلاً بعد فائدہ پہنچے۔اس واسطے ہم نے بسلاح مشیرانِ صاحب دبیر یہ تجویز کی ہے کہ ایک اپر انگلش اسکول بہاول پور میں صاحب ممدوح کا نام پیار سے یادرکھنے کے لیے قائم کیا جائے۔اس مدرستہ کا خرچہ تقریباً پانچ ہزار روپیہ سالانہ ہوگا۔اس میں انگریزی، عربی، فارسی اور ریاضی وغیرہ کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہوگی۔یعنی دینی و دنیاوی فوائد حاصل ہوں گے۔ہم کو اُمید ہے کہ آپ صاحبان اس تجویز کو دل سے قبول کریں گے۔چنانچہ ۱۳ اپریل ۱۸۸۲ء کے دن نارمل اسکول کو اینگلوورنا کیولر ہائی سکول کا درجہ دے کر اس نام ایجرٹن پرائمری اپر اسکول بہاول پور رکھا گیا۔جس میں نویں اور دسویں کی صرف دو کلاسیں قائم ہوئیں۔یہ ایجرٹن اسکول جس عمارت میں قائم کیا گیا وہ بازار چاہ فتح خاں میں متصل مسجد گل محمد خاں صاحب مشیر تصریفات واقع ہے جس میں ۱۹۱۱ سے تاحال جوبلی ہسپتال

قائم ہے۔ اس اپر ایجرٹن اسکول کے لیے معاون (فیڈر) مشن اسکول تھا۔ ۱۲ مئی ۱۸۸۲ء کو مشن اسکول کے دو طالب علم مڈل کے امتحان میں کامیاب ہو کر ایجرٹن اپر اسکول میں داخل ہو گئے۔ ایک مہینہ کے اندر اسکول نے خاصی ترقی کی اور خاصی تعداد میں طلباء داخل ہوئے۔ ''اس کی روز افزوں ترقی سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ شاید ایک لڑکا بھی اپر اسکول سے باہر نہ رہے گا''۔ ابتدا میں ۷ طلبا، انگریزی کی کلاس میں داخل ہوئے تھے جو ایک ماہ میں ۵۵ ہو گئے۔ ۲۲ عربی کی کلاس میں داخل ہوئے تھے اور ۱۱ فارسی میں۔ اس ہائی اسکول کے پہلے ہیڈ ماسٹر بابو غلام حسین ۱۰۰ روپیہ ماہوار تنخواہ پر مقرر ہوئے۔ جو عربی، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں میں فضیلت کا درجہ رکھتے تھے۔ اسکول کی یہ نمایاں ترقی ان کی ہر دلعزیزی اور محنت کا نتیجہ تھی۔ اس اسکول کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ۱۸۸۲ء میں ہی ایک اورنٹیل ڈیپارٹمنٹ اسکول میں شامل کیا گیا۔ اس اورنٹیل ڈیپارٹمنٹ کی ابتدائی شکل ایک عربی مدرسہ تھا جو دیگر عربی مدارس کے ساتھ ۱۸۷۹ء میں بہاول پور میں قائم کیا گیا تھا۔ اورنٹیل ڈیپارٹمنٹ کے قیام کا مقصد تھا کہ طلباء کو پنجاب یونیورسٹی کے اورنٹیل فیکلٹی کے امتحان کے لیے تیار کیا جا سکے۔ اورنٹیل ڈیپارٹمنٹ یا عربی سیکشن میں مولوی عالم، مولوی فاضل اور منشی عالم وغیرہ کے امتحانات کی تیاری کرائی جاتی تھی۔ عربی سیکشن کے نصاب میں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ شامل تھے۔ اپر ایجرٹن اسکول کے انگریزی سیکشن کا نصاب علیحدہ تھا۔ جہاں تین ماسٹر پڑھاتے تھے۔ اورنٹیل سیکشن میں انگریزی ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی تھی۔ اس اورنٹیل سیکشن کو بھی اورنٹیل سکول کا درجہ دے دیا گیا۔ جہاں عربی، فارسی اور ریاضی کا امتحان پاس کرنے پر ہائی اسکول کی سند دی جانی طے ہوئی۔ اس میں بھی دو نصاب رائج تھے۔ ایک میں وہ طلباء جو عربی فارسی کے ساتھ دینیات یعنی تفسیر حدیث اور فقہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور دوسرے میں وہ جو عربی فارسی کی تعلیم حاصل کر کے پنجاب یونیورسٹی کے امتحان میں شریک

ہوئے تھے اس سیکشن کے انچارج شعبہ عربی کے مدرس اوّل مولانا خلیل احمد سہارنپوری تھے۔ جو فاضل دیو بند تھے۔ مولوی نورالدین صاحب عربی فارسی پڑھانے پر مامور تھے۔ ریاضی کے لیے منشی کھلندہ رام مدرس نارمل اسکول تھے۔ اور منشی علی بخش سیکنڈ ماسٹر انگریزی کے لیے رکھے گئے تھے۔ اورئنٹل ڈیپارٹمنٹ یا شعبہ دینیات کے قیام سے ریاست کے جملہ عربی مدارس اس کے انصرام میں دے دیئے گئے۔ اس طرح یہ تمام مدارس ریاست کے محکمہ تعلیم کے ہاتھ میں چلے گئے۔

ریاست میں تعلیمی ارتقاء کے ابتدائی دور میں شعبہ تعلیم علیٰحدہ نہ تھا بلکہ تمام تعلیمی انتظام کے لیے ایک ایجوکیشن کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جس کے صدر ریاست کے وزیراعظم ہوتے تھے اور جس کے اراکین میں پنڈت بشمبر ناتھ میر منشی وزارت، میر ممتاز علی میڈیکل آفیسر، مولوی محمد اشرف علی صاحب مشیر حاضر باش، مہتہ پہلومل سپرنٹنڈنٹ جیل خانہ، مولوی نجیب الدین سب جج بہاول پور، صاحبزادہ محمد معروف خاں صاحب کنزرویٹر جنگلات، سید چراغ علی شاہ آفیسر مدارس، حکیم رحیم بخش صاحب سیکرٹری کمیٹی، قاضی بہاول پور، بابو غلام حسین ہیڈ ماسٹر ایجرٹن اسکول، منشی مقدم رائے سرپرست منڈی اور منشی غلام نبی خاں صاحب چیف جج بحیثیت سیکرٹری کمیٹی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے اسکول ہذا کے نصاب کی طرف بھی توجہ دی اور یہ طے کیا کہ جو کتابیں نصاب میں شامل کی جائیں ان میں خدااور رسول کا ذکر ضرور ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے ایک سلیبس کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں مولوی محمد اشرف علی صاحب، مرزا محمد اشرف صاحب، مولوی خلیل احمد صاحب، مولوی نور الدین صاحب اور منشی معراج الدین صاحب کو رکھا گیا۔ ۱۸ جون ۱۸۸۲ء کو ایجوکیشن کمیٹی کا اجلاس ہوا تو ایجرٹن اسکول کے انتظام کے لیے ایک ایگزیکٹو کمیٹی مرتب کی گئی جس کے اراکین بابو شمبھو ناتھ، پنڈت بشمبر ناتھ، مہتہ پہلومل، معروف خاں صاحب، مولوی اشرف علی صاحب، سید چراغ شاہ صاحب، حکیم رحیم بخش صاحب، بابو غلام حسین صاحب

ہیڈ ماسٹر اور منشی غلام نبی صاحب سیکرٹری ایجوکیشن کمیٹی تھے۔ ایجوکیشن کمیٹی نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ سب مسلمان لڑکوں کو نماز کی تلقین کی جائے اور مولوی خلیل احمد صاحب و مولوی نور الدین صاحب باری باری بچوں کو وعظ و نصیحت کیا کریں۔ ۷ جولائی ۱۸۸۲ء کو بابو غلام حسین ہیڈ ماسٹر نے اچانک اسکول سے علیحدگی اختیار کر لی اور بہاول پور سے رخصت ہو گئے۔ ایجوکیشن کمیٹی کے فیصلے کے مطابق مدرسہ صدر دینیات جو مولانا خلیل احمد صاحب اور نارمل اسکول جو سید چراغ شاہ صاحب کے تحت چل رہے تھے اپر ایجرٹن سکول میں شامل کر دیئے گئے۔ ستمبر ۱۸۸۲ء میں مولوی اشرف علی صاحب کو اس اسکول کا ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا گیا۔ ۲۲ نومبر ۱۸۸۳ء کو اپر ایجرٹن اسکول کا پہلا جلسہ تقسیم انعامات منعقد ہوا جس کی صدارت ریاست کے وزیر اعظم محمد مہدی خان صاحب نے کی۔

ہیڈ ماسٹر مولوی اشرف علی صاحب نے اپنے سپاسنامہ میں اسکول کی کارکردگی کا جائزہ پیش کیا اور بتایا کہ اس وقت اسکول ہذا میں آٹھ اساتذہ کام کر رہے ہیں۔ جن میں ۳ انگریزی کے لیے ۳ عربی کے لیے اور ۲ فارسی کے لیے ہیں۔ طلباء کی تعداد ۵۵ ہے۔ انٹرنس کے امتحان میں ۱۸ طالب علم شریک ہوئے جس میں سے بارہ پاس ہوئے۔ اس تعداد سے اُمید کی جا سکتی ہے کہ اس مدرسہ میں کالج ڈیپارٹمنٹ کی پڑھائی کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی طرف سے اس رپورٹ میں کالج کلاسوں کے قائم کیے جانے کا یہ پہلا اشارہ تھا۔ یہی اشارہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کالج کے اجراء کا سبب بنا۔ ۱۴ فروری ۱۸۸۴ء کو گورنر پنجاب چارلس ایچلیسن نے اسکول کا معائنہ کیا۔

نواب صاحب موصوف خود بھی تعلیم کے فروغ میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اسی لیے بسا اوقات وہ خود اسکول تشریف لے جا کر بچوں کا امتحان لیتے تھے۔ ۲۵ مئی ۱۸۸۵ء یوم دوشنبہ کو ایجرٹن اسکول میں تقسیم انعامات کے لیے ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت نواب صاحب نے کی اور ان کے پیر و مرشد مشہور صوفی بزرگ خواجہ فرید رحمۃ اللہ علیہ بھی

ان کے ساتھ جلسہ میں شریک ہوئی۔ اس وقت اس اسکول میں طلباء کی تعداد ۱۵ تھی جس میں ۲۹ مسلمان اور ۲۲ ہندو تھے۔ تقریباً اسی زمانہ میں اس اسکول میں سائنسی علوم کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا اور فزکس و کیمسٹری کی تعلیم شروع ہوئی۔ ایجوکیشن کمیٹی کی قرارداد مورخہ ۳۱ اگست ۱۸۸۵ء ان سائنسی علوم کی تجربہ گاہ کے لیے تجربے کا ضروری سامان خریدنے کے لیے رقم کی منظوری دی گئی۔ اسی سال ایک اینگلو ورنا کیولر مڈل اسکول صادق اسکول کے نام سے کھولا جو صادق الانوار پریس سے ملحقہ عمارت میں قائم کیا گیا۔ اور جہاں رؤسا اور شرفا کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ اسکول دراصل پرائمری کلاس تک ۱۸۸۳ء ہی میں قائم کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں اسے اینگلو ورنا کیولر مڈل کا درجہ دیا گیا۔ ابتدا میں یہ اسکول مقامی چندہ سے کھولا گیا لیکن بہت جلد ریاست کے محکمہ تعلیم نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس اضافے سے ایجرٹن اسکول کے لیے دو معاون اسکول بن گئے۔ مشن اسکول اور صادق اسکول جو دونوں اینگلو ورنا کیولر مڈل تک تعلیم دیتے تھے۔ مولوی محمد اشرف علی صاحب ہیڈ ماسٹر ایجرٹن اسکول کو ضلع گوجرانوالہ میں انسپکٹر مدارس مقرر کر دیا گیا۔ لہٰذا وہ جولائی ۱۸۸۶ء کو اپنی خدمات سے سبکدوش ہو گئے اور لالہ گنڈامل کو قائم مقام ہیڈ ماسٹر بنایا گیا۔ ۱۸۔ اگست کو نواب صاحب نے ایجرٹن اسکول کا ملاحظہ فرمایا اور نویں دسویں جماعت کی انگریزی کا امتحان خود لیا۔ فارسی کا امتحان وزیر اعظم و مشیر مال نے لیا۔ عربی کے طلباء سے تفسیر جلالین کا ایک آدھ مقام سُنا۔

۲۷ ستمبر ۱۸۸۶ء کو اسکول میں تقسیم انعامات کی غرض سے ایک سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں وزیر اعظم عمائدین ریاست و شرفا نے شرکت کی۔ نواب صاحب نے صدارت فرمائی۔ منشی غلام نبی صاحب سیکرٹری ایجوکیشن کمیٹی نے رپورٹ پیش کی۔ نواب صاحب نے طلباء کو انعامات اور اساتذہ کو خلعتیں مرحمت فرمائیں رپورٹ میں اس بات کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا کہ ایجرٹن ہائی سکول کی دونوں شاخیں علوم مغربی و مشرقی کو ترقی

دے کر کالج کے درجہ تک پہنچا دیا گیا ہے۔ گزشتہ سال کے نتائج امید افزا اور قابل تعریف رہے۔ جملہ امتحانات یونیورسٹی میں ۲ اطلباء شامل ہوئے اور پاس ہوئے۔ انٹرنس انگریزی میں ۳ طالب علم شامل ہوئے اور تینوں کامیاب ہوئے۔ فزکس اور کیمسٹری کی تجربہ گاہوں کے لیے آلات تجزیہ لندن سے منگوائے گئے۔ اسکول ہذا کی لائبریری میں ۴۹۵ کتابیں موجود تھیں جن میں ۲۴۷ انگریزی ۹۰ عربی ۸۳ اردو اور ۷۵ فارسی کی تھیں۔ طلباء کی جسمانی صحت کا تسلی بخش انتظام کیا گیا۔ کرکٹ اور بیڈمنٹن کھیلی جاتی تھی۔ اور جسمانی ورزش کا معقول انتظام تھا۔ اسکول کا بورڈنگ ہاؤس تیار ہوا جس میں ۱۹ طالب علم رہتے تھے جس کے مہتمم مولوی جمعیت علی صاحب تھے۔ ۱۰ اکتوبر ۱۸۸۶ء کو مرزا محمد اشرف ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ اپر ایجرٹن اسکول کے قیام سے ریاست میں علوم مغربی کا بیج بو دیا گیا جس میں کالج کلاسوں کا اجراء مستزاد تھا۔

۱۸۸۶ کا سال سابق ریاست بہاول پور کی علمی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ علم انسانی شعور و ادراک کی وہ رفعتیں عطا کرتا ہے جو اسے ستاروں پر کمندیں ڈالنا سکھاتی ہیں۔ علوم کو عام کرنے کی امنگ اور تعلیم کے ذریعہ ریاست کو ترقی دینے کا جذبہ بہاول پور کے فرمانروا نواب صادق محمد خاں چہارم کے اندر کچھ زیادہ ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ تحریک کے اثرات اور مغربی تعلیم کے ثمرات سے یہ خطہ بہاول پور پوری طرح بہرہ ور ہوا۔ ایجوکیشن کمیٹی نے کالج کھولے جانے کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس کے اجلاس مورخہ ۲۵ اپریل ۱۸۸۶ء میں تعلیمی ترقی کے لیے مختلف تجاویز پیش ہوئیں۔ ان تجاویز میں ایک یہ تجویز بھی پیش ہوئی ''کہ اپر اسکول میں افادہ متوطنان ریاست کی غرض سے سلسلہ اعلیٰ تعلیم کو ایف اے تک وسعت دی جانی ضروری ہے۔ تا کہ وہ طلباء جو درجہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد تحصیل آئندہ کا شوق رکھتے ہیں لیکن بزرگوں کی بے بضاعتی اور وجوہ سے مقامات دور دراز میں جا کر اپنے ارادہ کو

پورا نہیں کر سکتے نا کام نہ رہیں۔ چنانچہ مصارف زائد پر جو اس ترقی تعلیم کے لیے سر دست درکار ہیں غور ہو کر جمیع ممبر صاحبان جنرل کمیٹی نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ اور عطائے منظوری حضور سرکار عالی وام اقبالہٗ و برکاتہ کے لیے اس تجویز کو محکمہ عالیہ وزارت میں روانہ کیا۔ یقین ہے کہ حضور پر نور سرکار ابد قرار کی منظور خاص کے حاصل ہوتے ہی عنقریب بطور شائستہ تعلیم اعلیٰ کا سلسلہ ریاست میں قائم ہو کر آئندہ شائقین تحصیل اعلیٰ کو باہر جانے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔'' ۱۸۸۶ء میں انٹرنس کا نتیجہ نکلا اور ۸ طلباء میں سے ۷ کامیاب ہوئے ۳ ہندو اور ۴ مسلمان جو اس بات کا ثبوت تھا کہ بہاول پور کے اسکول کا معیارِ تعلیم کس طرح پنجاب کے نامور اسکولوں سے کم نہیں۔ گزشتہ سال کا نتیجہ بھی بہترین تھا۔ انٹرنس انگریزی میں ۳ طالب علم شریک ہوئے اور تینوں پاس ہوئے۔ اس کارکردگی کا پنجاب یونیورسٹی کے کنوکیشن میں بطورِ خاص ذکر کیا گیا تھا۔ اس نتیجہ کی بنیاد پر توقع کی گئی کہ فرسٹ ایئر آرٹس کی تعلیم جس کی منظوری نواب صاحب سے ہو چکی ہے بہت جلد ایجرٹن اسکول میں جاری کر دی جائے گی۔ ۲۲ ستمبر ۱۸۸۶ء کو جگن ناتھ کالج ڈھاکہ کے پرنسپل بابو پرسن کمار بوس کی تقرری بحیثیت پرنسپل منظور ہوئی اور ریاضی کے لیے پروفیسر رام رتن کا تقرر کیا گیا۔ بابو پرسن کمار ۱۶ اکتوبر کو بہاول پور پہنچ گئے اور ۱۷ اکتوبر سے چارج لے کر کام شروع کر دیا۔ اکتوبر ۱۸۸۶ء کے تعلیمی سال سے بہاول پور ایجرٹن کالج کا آغاز ہوا۔ جہاں انٹرمیڈیٹ آرٹس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ہائی سکول کی کلاسیں بھی اسی کالج کے ساتھ رہیں۔

یہ کالج مختلف عمارتوں میں قائم رہا اور بالآخر موجودہ عمارت میں منتقل ہو گیا۔ جس کی تفصیل ''ایس ای کالج۔ تاریخ کے آئینے میں'' اسطرح سے ہے۔

خطۂ بہاول پور ہمیشہ سے علم و دانش کا گہوارہ رہا ہے۔ اوچ شریف کی فیروزیہ یونیورسٹی پاک و ہند کی قدیم درس گاہوں میں ممتاز حیثیت رکھتی تھی۔ پھر بہاول پور کے

دوسرے شہر چتن منارا، سوئی وہار، مروٹ اور ڈیراور میں با قاعدہ منظم تعلیمی ادارے موجود تھے۔ عباسی حکمرانوں کا دورِ حکومت ۱۷۲۷ء سے ۱۹۵۵ء تک قائم رہا۔ اس علم دوست خاندان نے تعلیم و تعلّم کے لیے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ نوابین کی قائم کردہ علمی درس گاہوں میں گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

یہ عظیم دانش گاہ ۱۸۸۲ء سے قبل مڈل سکول کی صورت میں موجود تھی، ۱۸۸۲ء میں اسے اپر ایجرٹن سکول کے نام سے ترقی دی گئی اور پھر ۲۵ اپریل ۱۹۸۶ء کو مولوی محمد دین کی سربراہی میں ایجوکیشن کمیٹی کی سفارش کے نتیجے میں کالج کا درجہ ملا اور بہاول پور ایجرٹن کالج کا نام دیا گیا۔ بعد میں اس کا نام سابق فرماں روا عالی مرتبت سر صادق محمد خان عباسی چہارم اور گورنر پنجاب سر ای جی ایجرٹن کے ناموں کو ملا کر صادق ایجرٹن کالج بہاول پور رکھا گیا۔

صادق ایجرٹن کالج کو پنجاب کے قدیم ترین کالجوں میں ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس سے پہلے صرف دو ادارے گورنمنٹ کالج لاہور اور ایف سی کالج لاہور موجود تھے۔ اس مادرِ علمی کو دیگر تمام اداروں سے اس لیے بھی امتیاز حاصل رہا ہے کہ یہاں طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی بلکہ بہاول پور آ کر اس درس گاہ میں تعلیم پانے والوں کو معقول وظائف بھی دیئے جاتے تھے۔ خاص طور پر یتیم، بے سہارا اور مستحق طلبہ کے تمام اخراجات ریاست بہاول پور کی جانب سے ادا کیے جاتے تھے۔

کالج میں ۱۸۹۲ء میں ڈگری کلاسوں کا اجرا ہوا مگر طلبہ کی معقول تعداد نہ ہونے کی وجہ سے ۱۹۰۰ء میں ڈگری کلاسیں ختم ہو گئیں۔ بعد میں ۱۹۲۶ء میں دوبارہ بی اے کی کلاسوں کا اجراء ہوا۔ ایس ای کالج اپنے تاریخی حوالے اور علمی و فکری نتائج کی روشنی میں بھی ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ اس کے طلبہ نے جہاں علمی، ادبی اور کھیلوں کے میدان میں زمانہ طالب علمی میں نام پیدا کیا وہاں بہت سے طلبہ فارغ التحصیل ہو کر مختلف شعبہ ہائے

زندگی میں اپنی گراں قدر خدمات کے حوالے سے قومی ہیروز کی صف میں شامل ہو گئے۔
۱۹۲۲ء میں ایس ای کالج میں صرف ۲۲ طلبہ زیر تعلیم تھے، مگر آج اس چشمۂ حکمت سے تقریباً اٹھائیس سو (۲۸۰۰) طلبہ سیراب ہو رہے ہیں۔

۱۸۸۶ء میں جب کالج وجود میں آیا تو مولوی محمد دین صاحب کی زیر نگرانی سال اول میں داخلے ہوئے مگر پروفیسر پرسنا کمار بوس کو اس کالج کے پہلے پرنسپل ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس وقت مولوی محمد دین کے علاوہ مولانا جمعیت علی، لالہ رام رتن اور پنڈت چورامانی کالج کے اولین پروفیسرز مقرر ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریسی فرائض انجام دینے والے اساتذہ کی تعداد سات تھی۔ ایس ای کالج بہاول پور کا موجودہ تدریسی عملہ نوے صاحبِ کمال اساتذہ پر مشتمل ہے۔

۱۸۸۶ء میں صادق ایجرٹن کالج موجودہ جوبلی ہسپتال (زنانہ ہسپتال) کی عمارت میں شروع ہوا، پھر غالباً ۱۸۹۲ء میں کالج محل پورہ میں واقع جامعہ اسلامیہ کی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۰۷ء میں کرنل ڈلس نے کالج کی عمارت (موجودہ صادق ڈین ہائی سکول) کا سنگِ بنیاد رکھا، ساتھ ہی ایک ہوسٹل بھی تعمیر ہوا جس میں چالیس طلبہ کی گنجائش تھی۔ ۱۹۵۰ء میں موجودہ عمارت کا سنگِ بنیاد کرنل اے جے ڈرنگ نے رکھا۔ ایس ای کالج کی یہ پُرشکوہ عمارت چالیس سے زائد تدریسی کمروں کے علاوہ فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی کی دو دو لیبارٹریوں، جغرافیہ، شماریات، نفسیات اور شعبہ تعلیم کے لیے ایک ایک لیبارٹری پر مشتمل ہے۔

۱۹۵۰ء میں ایس ڈی ہائی سکول کے لیے نئی عمارت کی تعمیر شروع ہوئی جس کا سنگِ بنیاد کرنل ڈرنگ وزیراعظم نے رکھا تھا اور جو ۱۹۵۱ء میں مکمل ہو رہی تھی مسٹر ڈکفسن پرنسپل ایس ای کالج کو مشورہ دیا گیا کہ موجودہ عمارت میں کلاس روم کی قلت کو دور کرنے اور دوسرے تعلیمی تقاضوں کی تکمیل کے لیے مناسب ہوگا کہ ایس ڈی ہائی سکول کی نئی

عمارت میں اس کالج کو منتقل کر دیا جائے اور اس پرانی عمارت میں ایس ڈی ہائی سکول قائم کر دیا جائے اس تجویز پر عمل ہوا اور مئی ۱۹۵۱ء میں عملِ انتقال شروع ہوا۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کا تعلیمی سال ایس ای کالج کی موجودہ عمارت میں شروع ہوا۔

(ایس ای کالج کے سو سال (۱۸۸۶۔۱۹۸۶ء۔ص ۴۳۔۴۴)

اب ایس ای کالج پوسٹ گریجوایٹ کالج ہے اور انگریزی، اکنامکس، شماریات، کیمسٹری اور باٹنی کی کلاسیں جاری ہیں۔ اسلامیات اور انٹرنیشنل ریلیشنز کے مضامین کی منظوری مل چکی ہے مگر تا حال ان میں داخلے نہیں ہوئے۔

جہاں تک تعلیمی اور ہم نصابی سرگرمیوں کا تعلق ہے اس کا گراف بہت اونچا ہے اور اپنی تعلیمی خدمات کے تناظر میں اس کا شمار ملک کے بہترین اداروں میں ہوتا ہے۔ سالانہ کنوکیشن (تقسیم اسناد) کی تقاریب بھی ہوتی رہتی ہیں اور ایسی تقریبات میں برصغیر پاک و ہند کی معروف علمی سیاسی اور ادبی شخصیات بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کر چکی ہیں جو اس ادارے کے لیے ہر اعتبار سے قابل فخر بات ہے تفصیل یہ ہے۔

میجر شمس الدین وزیر تعلیم بہاول پور	ستمبر ۱۹۳۵ء
سید سلیمان ندوی	۱۴ مارچ ۱۹۴۰ء
خلیفہ شجاع الدین	۷ مارچ ۱۹۴۳ء
ڈاکٹر ذاکر حسین	۲۶ اپریل ۱۹۴۶ء
پروفیسر تاج محمد خاں	۲۲ فروری ۱۹۸۷ء

جہاں تک ایس ای کالج کی علمی ادبی اور ہم نصابی سرگرمیوں کا تعلق ہے ان میں بھی یہ کالج پیش پیش رہا ہے اور اب بھی ہے اور تقسیم انعامات کی تقریبات میں فرمانروایان ریاست بہاول پور بھی تشریف لاتے رہے نواب صادق محمد خاں چہارم، نواب بہاول خاں

پنجم اور نواب صادق محمد خاں پنجم مختلف مواقع پر کالج کی علمی ادبی سرگرمیوں میں طلبہ اور اساتذہ کی ہمت افزائی کے لیے شرکت فرماتے رہے۔ ۲۴ مارچ ۱۹۲۳ء کے جلسہ کی صدارت کے لیے نواب صادق محمد خاں پنجم کو مدعو کیا گیا اور انہوں نے اپنی تقریر میں طلبہ کی کاوشوں کو سراہا۔

اس سلسلے میں اہم کارنامہ نخلستان ادب ☆ کا اجراء ہے اس کا پہلا شمار اپریل ۱۹۲۳ء کو شائع ہوا۔

جہاں تک نخلستانِ ادب کی تاریخ اشاعت کا تعلق ہے تو یہ مسئلہ متنازع ہے اس لیے کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ مجلہ ۱۹۱۲ء میں نکلا اور اس کے لیے انہوں نے دلائل بھی دیئے ہیں مگر چونکہ ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۲۲ء تک کا کوئی شمارہ سامنے نہیں آیا اور نہ ہی اس کا کوئی سراغ ملا ہے اس لیے یہ بات بحث طلب ہے اور اس کے بارے میں تحقیق جاری ہے تاہم ۱۹۶۲ء کے شمارے کو پچاس سالہ نمبر قرار دیتے ہوئے اس پر جاری شدہ ۱۹۱۲ء درج کیا گیا ہے اسی طرح ۱۹۷۲ء میں ساٹھ سالہ نمبر نکالا گیا تو یہ بھی ۱۹۱۲ء کے حوالے ہی سے ہے اسی طرح ۱۹۷۶ء میں قائداعظم نمبر نکلا تو اس پر بھی جاری شدہ ۱۹۱۲ء درج ہے۔
میں نے جب ۲۸ نومبر ۲۰۰۵ء کو ایس ای کالج کے پرنسپل کا عہدہ سنبھالا تو احباب کو پتے کی تبدیلی کی اطلاع دینے کے لیے مراسلہ بھیجا تاکہ خط وکتابت اور ترسیل ڈاک میں آسانی بھی رہے اور اس میں باقاعدگی بھی پیدا ہو۔ اس کے جواب میں احباب کے خطوط بھی آتے رہے اور کتب ورسائل کی آمد کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ایسے احباب میں گوجرانوالہ کے ضیاء اللہ کھوکھر بھی شامل ہیں جنہیں ادب سے گہری دلچسپی ہے اور اُنہوں نے اپنے مرحوم والد کے نام سے عبدالمجید کھوکھر یادگار لائبریری قائم کر رکھی ہے جس میں رسائل اور اخبارات کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جو محققین کے لیے مواد کی فراہمی کا

☆ جشنِ صد سالہ ۱۸۸۶ـ۱۹۸۶ء

بہترین ذریعہ بن چکا ہے۔ اب تک ان کے جو خطوط موصول ہوئے ہیں ان کا اندراج یہاں پر بے معنی نہیں ہوگا۔

محترم جناب تونسوی صاحب!

گزشتہ آٹھ دس ماہ سے کتابوں اور رسالوں کی جلد بندی کا کام جاری ہے۔ کتابیں اور رسالے اپنے اصل مقام سے اِدھر اُدھر ہونے کی بناء پر انہیں تلاش کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ماہنامہ ''پرواز'' لائلپور کے دو چار شمارے ہماری لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ملنے پر مطلوبہ صفحات کے فوٹوسٹیٹ ارسال خدمت کر دوں گا۔

گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کے پرنسپل کا عہدہ سنبھالنے پر دلی مبارک باد قبول فرمایئے۔ آپ کا کالج اپنا ادبی و علمی مجلہ ۱۹۲۳ء سے نکال رہا ہے۔ اُمید ہے اس مجلے ''نخلستانِ ادب'' کے کئی شمارے کالج کے گودام میں پڑے ہوں گے۔ کیا ''نخلستانِ ادب'' کے دستیاب شماروں کی ایک ایک کاپی ارسال فرمانے کی زحمت فرمائیں گے! اولین شمارہ یا اُس کا فوٹوسٹیٹ بھی مطلوب ہے۔ اُمید ہے مناسب توجہ فرمائیں گے۔

والسلام: ضیاءاللہ
۱۴۔۳۔۲۰۰۶

محترم جناب تونسوی صاحب!

آج ہی کتابوں کا ایک بنڈل روانہ کر دیا ہے۔ ''فہارس الاسفار'' کے صرف دو چار نسخے ہی بچ پائے ہیں۔ زیادہ ہوتے تو بھجوا دیتا۔ ہمارے پاس ''نخلستان ادب'' کے مندرجہ ذیل شمارے محفوظ ہیں۔

۱۔ ۱۹۸۴۔۱۹۸۵ء ۲۔ صد سالہ نمبر ۱۹۸۶ء

۳۔ پاکستان گولڈ جوبلی نمبر ۴۔ ۲۰۰۰ء

۵۔ قائداعظم نمبری ۲۰۰۳ء

''نخلستان ادب'' کے شماروں میں اسے ''پاکستان کا قدیم ترین میگزین'' قرار دیا گیا ہے۔ ''ایس ای کالج کے سو سال'' میں پروفیسر منور علی خاں کے پیش لفظ سے 'OASIS' اور 'نخلستان ادب' کے ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء کے چار نادر شماروں سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا پہلا شمارہ کب شائع ہوا۔ "OASIS" کے بارے میں بھی جاننے کا خواہش مند ہوں۔ تعلیمی اداروں کے رسائل کے تعارف کے سلسلے میں مجھے ان رسائل کے متعلق بنیادی معلومات درکار ہیں۔ ''راوی'' لاہور کا آغاز غالباً ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ ۱۹۱۷ء کے بعض شمارے ہمارے ہاں محفوظ ہیں۔ ''کریسنٹ'' لاہور ۱۹۲۳ء کے بعض شمارے ہماری لائبریری میں محفوظ ہیں۔ یہ تعین کرنا ضروری ہے کہ کس کالج کا میگزین سب سے پہلے منظر عام پر آیا۔ اسی سلسلے میں آپ سے رہنمائی کا متمنی ہوں۔ ''نگار'' کے بعض شماروں کو دیکھا ہے۔ ابھی تک محشر تونسوی کا کوئی مضمون نظر نہیں آیا فرصت ملے تو دوسرے شماروں میں بھی محشر تونسوی کو تلاش کروں۔

اُمید ہے، بخیر و عافیت ہوں گے۔

والسلام: ضیاء اللہ کھوکھر

۱۶۔۳۔۲۰۰۶

محترم جناب ڈاکٹر صاحب!

ارسال کردہ مختلف کالجوں کے مجلّے چار پیکٹوں کی صورت میں بحفاظت موصول ہوئے۔ شمار کیے تو بیس سے زائد نکلے، اتنی بڑی تعداد نے خوشگوار حیرت میں ڈال دیا۔ آپ کی علم دوستی کا یہ ایسا گرانقدر تحفہ ہے جس کی خوشبو اور روشنی سے ہماری لائبریری مہکتی اور چمکتی رہے گی۔ اظہارِ تشکر میں کیا کہوں؟ جذبات کی ترجمانی نوکِ قلم پر لانے سے قاصر ہوں۔ بس اللہ تعالیٰ کے حضور میں دست بدعا ہوں کہ آپ کو خیر و برکت سے نوازے اور خوش و خرم رکھے۔

جن کالجوں کے مجلّے موصول ہوئے ہیں۔ ان کے سربراہوں کو شکریے کے ساتھ مطلع کر رہا ہوں۔

''پرواز'' کا مطلوبہ سرورق ارسال خدمت ہے۔ معلوم نہیں یہ کوتاہی کیسے سرزد ہوگئی۔

اُمید بخیر و عافیت ہوں گے۔

والسلام: ضیاء اللہ کھوکھر

۹۔۴۔۲۰۰۶

محترم جناب ڈاکٹر تونسوی صاحب!

السلام علیکم!

کالج مجلوں کا ایک اور بنڈل پا کر دل خوشی و مسرت سے معمور ہوا۔آپ کی ان بے در پے اور بے لوث نوازشوں نے ایسا نقش چھوڑا ہے، جسے میرا دل و دماغ محسوس تو کرسکتا ہے لیکن اس کے اظہار سے عاجز ہے۔

جو ادبی و علمی جواہر میری دسترس میں آنے والے نہیں تھے ان کا حصول آپ کی حسن تدبیر نے ممکن بنادیا۔

آپ کی اس مساعی حسنہ سے ہماری لائبریری میں بہاول پور ڈویژن کے کالج مجلوں کی بھرپور اور موثر نمائندگی حاصل ہوگئی۔ جو ہمارے لیے ایک بڑا اعزاز ہے۔

کالج مجلوں کی فہرست میں ان مجلوں کے اندراج سے فہرست تو بلاشبہ وسعت نصیب ہوگی۔اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کارِ بے کار سے نقاد اور محقق حضرات اُردو ادب کے ارتقاء میں ان مجلوں کو حسبِ معمول نظرانداز رکھنا جاری رکھیں گے؟

اُمید ہے بخیر و عافیت ہوں گے۔

والسلام: ضیاء اللہ کھوکھر

۲۶۔۴۔۲۰۰۶

محترم جناب ڈاکٹر تونسوی صاحب!

ارسال شدہ کالج جریدوں سے لبالب پیکٹ موصول ہوا، پا کر دل جھوم اٹھا فرطِ مسرت سے انہیں آنکھوں سے لگایا اور فوری طور پر انہیں تعلیمی اداروں کے جرائد کی زیرِ ترتیب فہرست کی زینت بنایا۔ زیادہ تر جریدوں کا تعلق رحیم یار خان کے کالجوں سے تھا۔ گورنمنٹ کالج وہاڑی کا ''گنجینۂ نگارش'' اور لاہور کا ''المیشت'' اس خوش خبری کی نوید دے رہا تھا کہ اب آپ کی علمی وادبی نوازشوں کا دائرہ بہاول پور ڈویژن کی حدود سے تجاوز کیا ہی چاہتا ہے۔ اور ابھی ابھی ''گورڈونیق'' راولپنڈی اور ''نہار قلم'' لودھراں کے تحالف کیا وصول ہوئے کہ ہماری لائبریری موسم بہار کی دلفریب اور پرکیف فضا سے معمور ہو اٹھی۔ زبان سے کیا کہوں آپ کے عطا کردہ تحالفِ علیہ کو دیکھتا ہوں تو دعا دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے۔ گمان غالب یہی ہے کہ قرب وجوار کے علاوہ دور دراز کے شہر اور قصبے پوری طرح آپ کے میزائلوں کی زد میں آچکے ہیں۔

فہرست کے چند منتخب اوراق ارسال خدمت ہیں۔ اصلاح وتہذیب کے لیے آپ سے رہنمائی کا متمنی ہوں اس فہرست کو یہ امتیاز حاصل ہو کر رہے گا کہ اس میں بہاول پور ڈویژن کے جرائد ہر لحاظ سے غالب رہیں گے۔ آپ کی غیر معمولی دلچسپی اور علم دوستی کی بدولت ایسے بے شمار نظر انداز اور فراموش شدہ کالج میگزین اہل علم ودانش کو ہلکی سی جنبش ضرور دیں گے اور زیرلب اپنا تعارف کرائیں گے کہ ملاحظہ فرماؤ کہ ہمارے دامن نے علم وادب کے کیسے کیسے نادر جواہر کو سمیٹ رکھا ہے۔ حیرت ہے کہ تاریخ ادب وصحافت کی کسی کتاب میں کالج جریدوں اور (ڈائجسٹوں) کا برائے نام ذکر تک بھی دیکھنے کو نہیں ملتا۔

اُمید ہے بخیر وعافیت ہوں گے۔

والسلام: ضیاء اللہ کھوکھر

٦-٥-٢٠٠٦

۱۶ مارچ ۲۰۰۶ء کے خط میں اُنہوں نے نخلستان ادب کے پہلے شمارے کی اشاعت کے بارے میں استفسار کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ یہ تعین کرنا ضروری ہے کہ کس کالج کی میگزین سب سے پہلے منظرِ عام پر آیا اس سلسلے میں میں آپ سے رہنمائی کا متمنی ہوں۔

خط کے ان مندرجات نے میری تحقیقی حس کو بیدار کیا اور میں نے اس کا کھوج لگانے اور ان کے حکم کی تعمیل کرنیکا ارادہ کیا اس حوالے سے میں نے معلومات اکٹھا کرنا شروع کیں۔ میں نے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کے چیف لائبریرین عبدالوحید صاحب کو اس بارے میں خط لکھا اور اُنہوں نے مدیرانِ راوی کی فہرست بھجوادی جس کیمطابق راوی کا پہلا شمارہ ۱۹۱۰-۱۲ء میں نکلا (فہرست شامل ہے تاکہ اس کے مدیران کے ناموں سے بھی آگاہی ہوجائے)۔

۱۹۱۰-۱۲ء	ایس ایم ذولفقارالدین
۱۹۱۲-۱۳	محمد اقبال
۱۹۱۴ء	گرودت کارویل
۱۹۱۹-۲۱ء	احمد شاہ بخاری (پطرس)
۱۹۲۱ء	سید امتیاز علی تاج
۱۹۲۲-۲۳ء	اگراسین
۱۹۲۳-۲۴	فضل حق معتصم
۱۹۲۴ء	صغیر احمد ہاشمی
۱۹۲۵ء	شیخ عبدالرحمٰن
۱۹۲۵-۲۶ء	تاج محمد خیال
۱۹۲۶-۲۷ء	سید حسن جعفری

مئی ۱۹۲۷ء	حافظ عبدالحمید
۲۸۔۱۹۲۷ء	شیخ فاروق احمد
۲۹۔۱۹۲۸ء	محمد مسعود
۳۰۔۱۹۲۹ء	شیخ محمد اکرم
۳۱۔۱۹۳۰ء	فضل محمد افضل
۳۲۔۱۹۳۱ء	ن۔م راشد
۳۳۔۱۹۳۲ء	نسیم حسن
۳۴۔۱۹۳۳ء	عمر فاروق
۱۹۳۴ء	آغا عبدالحمید
۳۵۔۱۹۳۴ء	ظہیرالدین
۱۹۳۵ء	بشیر احمد قریشی
۱۹۳۶ء	محمد حسین، بشیر چوہدری
۳۷۔۱۹۳۶ء	شمشاد قریشی
۳۸۔۱۹۳۷ء	سید محمد جعفری، محمد کیانی
۳۹۔۱۹۳۷ء	وشوامتر عادل، حامد کیانی
اپریل ۱۹۳۹ء	محمد صدیق اولکھ
اکتوبر ۱۹۳۹ء	منظور الحق
۴۰۔۱۹۳۹ء	ریاض الدین احمد
جون ۱۹۴۰ء	رؤف شیخ، مبارک مسعود
۴۱۔۱۹۴۰ء	محمد اقبال
۴۲۔۱۹۴۱ء	رؤف شیخ

۱۹۴۲_۴۳	امان اللہ سردار
۱۹۴۴_۴۵ء	ضیاء جالندھری
۱۹۴۵ء	عبدالکریم خالد (ایڈیٹرانچیف ارملاسوندھی)
۱۹۴۵_۴۶ء	محمد حسین (ایڈیٹرانچیف عبدالسلام)
۱۹۴۶_۴۷ء	ایم۔ایچ شمیم (ایڈیٹرانچیف منظر بشیر)
۱۹۴۶_۴۸ء	احسان الحق
۱۹۴۸_۴۹ء	اعجاز فاروقی
۱۹۴۹_۵۰ء	بذل حق محمود
۱۹۵۰_۵۲ء	مظفر علی سید
۱۹۵۲ء	شہزاد احمد
۱۹۵۳ء	محمود سلیم جیلانی
۱۹۵۴ء	حسن نواز گردیزی
۱۹۵۵ء	حنیف رامے
۱۹۵۶ء	محمد اسلم
۱۹۵۷ء	انیس ناگی
۱۹۵۸ء	شریف خالد لون
۱۹۵۹	شوکت کاظمی
۱۹۶۰ء	اقبال معین
۱۹۶۱،۶۲ء	انور ادیب
۱۹۶۳ء	محمود شام
۱۹۶۴ء	راحت نسیم

۱۹۶۵ء	شاہد نبی ملک
۱۹۶۶ء	یعقوب ناسک
۱۹۶۷ء	سرمد صہبائی
۱۹۶۸ء	اسداللہ غالب
۱۹۶۹ء	محمد اجمل نیازی
۱۹۷۰ء	سہیل صفدر
۱۹۷۱ء	اطہر وقار عظیم
۱۹۷۲ء	محمد اشرف عظیم
۱۹۷۳ء	وحید رضا بھٹی
۱۹۷۴ء	یاصر سلطان کاظمی
۱۹۷۵ء	سراج منیر
۱۹۷۸۔۷۹ء	سجاد سلیم ہوتیانہ
۱۹۷۹۔۸۰ء	خالد منظور بسرا
۱۹۸۱۔۸۲ء	سلمان باسط
۱۹۸۲۔۸۳ء	محمد جاوید غنی
۱۹۸۳۔۸۴ء	احمد علیم
۱۹۸۴۔۸۵ء	لیلیٰ صدیق
۱۹۸۶ء	بدر منیر الدین
۱۹۸۷ء	عباس تابش
۱۹۸۸۔۸۹ء	ظہور احمد
۱۹۹۰۔۹۱ء	سعشہ خان

۱۹۹۲ء	محمد اطہر مسعود
۱۹۹۳ء	عبدالحمید بھٹہ
۱۹۹۴ء	محمد حسن رضا گوندل
۱۹۹۵ء	خالد محمود سنجرانی
۱۹۹۶ء	طیب رشید
۱۹۹۷ء	محمد اعظم وڑائچ
۱۹۹۸ء	محمد صدیق اعوان
۱۹۹۹ء	محمد صلاح الدین ایوبی
۲۰۰۰ء	عزیر احسن
۲۰۰۱ء	علی عثمان قاسمی
۲۰۰۲ء	محمد علی خان
۲۰۰۳ء	عبدالسمیع
۲۰۰۴ء	نعیم امجد
۲۰۰۵ء	ریاض الحسن

جہاں تک اسلامیہ کالج لاہور کا تعلق ہے تو میں نے اپنے دانشور دوست اور نامور شاعر و نقاد پروفیسر غلام حسین ساجد سے درخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں مجھے معلومات فراہم کریں ان کی اطلاع کے مطابق اسلامیہ کالج لاہور یکم مئی ۱۸۹۲ء کو شیرانوالہ گیٹ میں کھولا گیا اور پھر ۱۹۰۶ء میں ریلوے روڈ پر موجودہ عمارت میں منتقل ہو گیا۔اس کے مجلّے کریسنٹ کا پہلا شمارہ ۱۹۰۸ء میں نکلا۔اسی طرح اگر یہ طے کرلیا جائے کہ نخلستان ادب کا شمارہ ۱۹۱۲ء میں نکلا تو پھر یہ نتیجہ نکلا جا سکتا ہے کہ کالج کے مجلوں کے سلسلے میں ابھی فیصلہ کرنا باقی ہے۔ تاہم اگر یہ شمارہ ۱۹۲۳ء میں نکلا (اگلے صفحات میں بحث

ہوگی) تو پھر مدیران کی میسر شدہ فہرست کیمطابق ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۱ء تک کے شماروں کے بارے میں معلومات نہیں مل سکیں اس انہیں خالی رکھا گیا ہے اور اب تک کی فہرست یہ ہے۔

فہرست نخلستان ادب

(نخلستان ادب کے اس انتخاب کی ترتیب سے قبل تلاش بسیار کے بعد جو شمارے دستیاب ہو سکے اُن کی مجالس ہائے ادارت کی فہرست پیش کی جارہی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ فہرست مکمل ہے ادارہ اُن حضرات کا ممنوع وشکر گزار ہوگا جو ان شماروں کسی ممکنہ شمارے کی نشاندہی یا اہمی کے مدو ماسکیں)۔

اپریل ۱۹۲۳ء

اکتوبر ۱۹۲۳ء

جنوری ۱۹۲۴ء

اپریل ۱۹۲۴ء

جون ۱۹۳۰ء

اکتوبر ۱۹۳۱ء

بہار ۱۹۳۵ء	ڈائریکٹر: پروفیسر حافظ سید صادق علی	مدیر: احمد ندیم قاسمی
اپریل ۱۹۳۶ء	پروفیسر حافظ سید صادق علی	مدیر: رانا اختر الٰہی
اکتوبر ۱۹۳۶ء	پروفیسر حافظ سید صادق علی	مدیر: رانا اختر الٰہی
اپریل ۱۹۳۷ء	پروفیسر حافظ سید صادق علی	مدیر: غلام ربانی
جنوری ۱۹۳۸ء	پروفیسر حافظ سید صادق علی	مدیر: رانا سردار احمد
ستمبر ۱۹۳۸ء	پروفیسر حافظ سید صادق علی	مدیر: دلشاد کلانچوی
جنوری ۱۹۳۹ء	پروفیسر حافظ سید صادق علی	مدیر: دلشاد کلانچوی

اکتوبر ۱۹۳۹ء (سالگرہ نمبر) پروفیسر حافظ سید صادق علی مدیر: نور محمد علوی

اکتوبر ۱۹۴۰ء پروفیسر حافظ سید صادق علی مدیر: نور محمد علوی

بہار ۱۹۴۱ء (اقبال نمبر) پروفیسر حافظ سید صادق علی مدیر: علی محمد ڈار

مارچ ۱۹۴۳ء (تعلیم اساد نمبر) پروفیسر حافظ سید صادق علی مدیر: فتح محمد خاں

۱۹۴۶ء فتح نمبر ڈائریکٹر: ڈاکٹر محمد شجاع ناموس مدیر: نورالزمان احمد۔ لیثی

بہار ۱۹۴۷ء (بہار نمبر) ڈائریکٹر: ڈاکٹر محمد شجاع ناموس مدیر: نجم الدین مجاہد

اپریل ۱۹۵۰ء ڈائریکٹر: ڈاکٹر محمد شجاع ناموس مدیر: ایس نشین

جون ۱۹۵۱ء ڈائریکٹر: پروفیسر معین الدین حسن۔ لیثی نگران: پروفیسر محمد اعظم

مدیر: خورشید حسن

اکتوبر ۱۹۵۲ء ڈائریکٹر: پروفیسر معین الدین حسن۔ لیثی نگران: پروفیسر محمد اعظم

مدیر: خورشید حسن معاون: محمد حسین

اکتوبر ۱۹۵۳ء ڈائریکٹر: پروفیسر معین الدین حسن۔ لیثی نگران: پروفیسر دلشاد کلانچوی

مدیر: نظام الدین اختر کلانچوی

بہار ۱۹۵۴ء نگران: پروفیسر معین الدین حسن۔ لیثی مدیر اعلیٰ: پروفیسر دلشاد کلانچوی

مدیر: محمد لطیف جالندھری معاون: تسنیم الدین اسلم

اکتوبر ۱۹۵۵ء نگران: پروفیسر محمد نصیر انصاری مدیر: محمد منیر طاہر محمودی

معاون: عبدالطیف چوہدری

اکتوبر ۱۹۵۶ء نگران: پروفیسر محمد نصیر انصاری مدیر: محمد اسلم

معاون: حبیب اللہ غوری

مئی ۱۹۵۷ء نگران: پروفیسر محمد نصیر انصاری مدیر: محمد اسلم

معاون: حبیب اللہ غوری

مئی ۱۹۵۸ء	ڈائریکٹر: پروفیسر نصیر انصاری	نگران: پروفیسر محمد اعظم
	مدیر: عبدالکریم عاصی	معاون: فیض الصمد حنیف
	جوائنٹ ایڈیٹر: سید منظور محسن	
مارچ ۱۹۶۰ء (صدیقی نمبر)	پروفیسر محمد نصیر انصاری	مدیر اعلیٰ: پروفیسر محمد اعظم
	مدیر: محمد عبداللہ	معاون: احمد ضیاء اسلم سجاد
جنوری ۱۹۶۱ء	نگران: پروفیسر محمد اعظم	مدیر: وقار الاسلام شاہد
	معاون: اظہار رحمت۔ نظیر اعظم	
۱۹۶۲ء (پچاس سالہ نمبر)	نگران: پروفیسر محمد اعظم	مدیر: سید محمود جعفری
	معاون: فیض حسین، انوار الحق، نظیر اعظم	
بہار ۱۹۶۳ء	نگران: پروفیسر محمد اعظم	مدیر: نذیر اعظم
	مدیر معاون: وسیم خالد	
بہار ۱۹۶۴ء	نگران: پروفیسر محمد اعظم	مدیر: اختر بزمی
	معاون: اکرم شاہ، سرور انجم، سید عارف	
بہار ۱۹۶۵ء	نگران: پروفیسر محمد اعظم	مدیران: حافظ عمیر احمد قریشی، عبدالمنان
	معاون: پرویز حسن، محمود الرحیم جلالی	
بہار ۱۹۶۷ء	نگران: پروفیسر اسلم انصاری	مدیر: سلیم راشد
	نائب مدیر: انیس احمد	معاونین: نورالسلام صدیقی، وقار احمد
بہار ۱۹۶۸ء	نگران: پروفیسر سہیل اختر	مدیران: م۔ اسلم ملک، نسیم احمد طلعت

جنوری ۱۹۷۰ء نگران: پروفیسر سہیل اختر مدیر: ارشد کمال

معاون: نیاز حسین لکھویرا، ارتضیٰ قمر، قادر مصطفےٰ

۱۹۷۱ء نگران: پروفیسر سید بشیر فرحت مدیر: تاج محمد قریشی

معاون: رب نواز شہید، (نواز کاوش) محمد جمیل رشید

۱۹۷۳ء نگران: پروفیسر سید بشیر فرحت مدیر: ام۔اسلم ملک

معاون: رب نواز شہید (نواز کاوش)

۱۹۷۶ء (قائد اعظم نمبر) نگران: پروفیسر سید بشیر فرحت مدیر: نواز کاوش

معاون: وقار عزیز صدیق، محمد اکرم ملک

جنوری ۱۹۷۹ء (اقبال نمبر) نگران: پروفیسر عابد صدیق، پروفیسر انور صابر مدیر: شکیل احمد

نائب مدیر: غلام محمد، ندیم جاوید

جنوری ۱۹۸۲ء نگران: پروفیسر عابد صدیق، پروفیسر انور صابر مدیر: ظفر حسین مغل

نائب مدیر: حفیظ طاہر

۱۹۸۴ء نگران: پروفیسر سید محمد عارف مدیر: منور عثمانی

نائب مدیران: سید ذوالقرنین عسکری، رانا عبدالقیوم آفتاب

۱۹۸۶ء انتخاب نخلستان ادب

انتخاب وترتیب: پروفیسر انور صابر، نور الزمان اوج

۱۹۸۶ء (صد سالہ نمبر) پروفیسر سید محمد عارف، پروفیسر بشیر فرحت، جمیل احمد سحر، پروفیسر انور صابر

۱۹۹۷ء (گولڈن جوبلی نمبر) ڈاکٹر سید محمد عارف بشیر احمد فرحت، جمیل احمد سحر

۲۰۰۰ء (نیو ملینیم نمبر) ڈاکٹر سید محمد عارف، بشیر احمد فرحت، جمیل احمد سحر

۲۰۰۳ء (قائد اعظم نمبر) ڈاکٹر سید محمد عارف، جمیل احمد سحر

۲۰۰۶ء (خواجہ فرید نمبر) سر پرست: ڈاکٹر طاہر تونسوی، غلام محمد قمر

مدیر: ڈاکٹر انور صابر

اس فہرست پر نظر دوڑانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''نخلستان ادب'' باقاعدگی سے شائع نہیں ہوا بلکہ اس میں خاصے وقفے آتے رہے۔ صد سالہ نمبر کے گیارہ سال بعد گولڈن جوبلی نمبر آیا پھر تین سال بعد نیو ملینیم نمبر چھپا۔ پھر تین سال بعد قائداعظم نمبر منظرِ عام پر آیا اور اب تین سال کے وقفے کے بعد خواجہ فرید نمبر شائع ہوا ہے جس کے بارے میں بعد میں تذکرہ کیا جائے گا۔

بات نخلستانِ ادب کی تاریخ اجراء کی ہو رہی تھی اس سلسلے میں جو مختلف حوالے ملے ہیں اُنہیں دیکھتے ہیں۔

معروف شاعر اور صحافی جناب عبدالحمید ارشد نے اپنے مضمون ''اُردو ادب کے ابلاغ میں ایس ای کالج کا حصہ'' میں لکھا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں اس کالج کا مجلّہ نخلستان ادب جاری ہوا۔ انگریزی حصہ کا نام اوسس (OASIS) تھا۔ اس دوران میں مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی اس کالج میں بطور☆ اُستاد شامل ہوئے اُردو کو کافی سہارا ملا اور کالج کے میگزین نے بھی خاصی ترقی کی پروفیسر دلشاد کلانچوی اس کالج میں استاد اور پھر پرنسپل بھی رہے اسی طرح وہ ستمبر ۱۹۳۸ء اور جنوری ۱۹۳۹ء کے طالب علم مدیر بھی تھے اپنے مضمون ''نخلستان ادب میری نظر میں'' رقم طراز ہیں۔

صادق ایجرٹن کالج بہاول پور میں ۱۹۱۲ء سے ہی مجلّہ نخلستان ادب کا اجراء ہوا اس کے اجراء کا مقصد بھی یہی تھا کہ نوآموز طلبہ اپنے معیاری تحریریں اپنے ہی رسالے میں چھپوا سکیں یہ کچی پکی تحریریں کالجوں کے مجلوں میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور یہی صورتحال مجلّہ نخلستان ادب کی رہی ☆☆ پروفیسر معین الدین حسن قریشی جو کالج میں پروفیسر بھی رہے۔ اپنے مضمون ''صادق ایجرٹن کا سہ ماہی نخلستان ادب'' میں لکھتے ہیں:

☆ نخلستان ادب ساٹھ سالہ نمبر ۲ ۱۹۷ء۔ ۲۸۔

نخلستان ادب صد سالہ نمبر ۸۶ ۔ ۱۹۸۶ء ص ۱۵۴

☆☆ سہ ماہی الزبیر بہاول پور۔ بہاول پور کا سو سالہ صحافت نمبر شمارہ ۱ ۱۹۸۶ء۔ ص ۴۷

نخلستان ادب پاکستان گولڈن جوبلی نمبر ۱۹۹۷ء ص ۲۵

''۱۸۸۶ء میں صادق ایجرٹن سکول نے کالج کی شکل اختیار کی ۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلام نایاب ہونے کی وجہ سے کے ۔ پی باسو (K.P. Basu) بنگال کے مشہور الجبرادان کی خدمات بطور پرنسپل حاصل کی گئیں ۔ پھر مولوی فتح الدین بھی تشریف لائے بعد میں بالآخر ایک مسلمان پروفیسر عبدالحمید قابل پرنسپل بنگال سے ہی حاصل ہوئے ۔ انہوں نے آتے ہی اُردو بزم حمیدیہ کی بنیاد ڈالی ۔ پروفیسر محمد اشرف گورگانی انچارج کی وجہ سے اُسے چار چاند لگے ۔ کالج میں اُردو ادب کا چرچا ہوا ۔ شعروشاعری، افسانے، ڈرامے تخلیق ہوئے اور ۱۹۱۲ء میں ''نخلستان ادب'' منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا ۔

جس طرح صادق ایجرٹن کالج تمام ریاست ہائے پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے سب سے اولین سرکاری ادارے نے اعلیٰ تعلیم کی شمع اس تاریک ترین خطہ میں روشن کی ایسی طرح ''نخلستان ادب'' نے اس علاقے میں سب سے اولیں جریدے کے طور پر ادب اور صحافت کی بنیاد ڈالی ۔ ہزاروں طلباء کے لیے زمین ہموار کی ۔ نئی پود کے لیے مواد اور ماحول پیدا کیا ۔ پروفیسر عبدالحمید نے اپنے دس سالہ دور پرنسپل یعنی ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۰ء تک اس کی آبیاری کی اور آخر اُسے پروان چڑھایا ۔ ان کے ساتھ پروفیسر تاریخ محمد اشرف گورگانی اور پروفیسر محمد دین (فلسفہ ۔ انگریزی) نے جو کالج کے ابتدائی سالوں سے کام کر رہے تھے ۔ اس ادبی فکروذکر کی تعمیر میں کافی

حصہ لیا (ان دو حضرات نے ریاست کی تاریخ کو باقاعدہ مدون کرکے اُردو میں اُسے ''صادق التواریخ'' کے نام سے ۱۸۹۹ میں شائع کیا)۔

''نخلستان ادب'' کی گزشتہ ستر سالہ زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ اولین دور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۴ء تک ہے جب کونسل آف ریجنسی ختم ہوئی اور نواب سر صادق محمد خان صاحب عباسی خامس تخت نشین ہوئے۔ اندرونی خودمختاری حاصل ہوئی۔ ریاست کا نظم ونسق نامزد کابینۂ وزارت کے ذریعے چلنا شروع ہوتا ہے۔ تعلیم عام ہوتی ہے جگہ جگہ مدارس کھولے جاتے ہیں۔ عربی امدادی مکتب، انگریزی پرائمری مڈل سکول عام ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس ابتدائی دور میں اُردو زبان کافی نشوونما پاتی ہے لیکن عربی، فارسی کا اثر کافی دیر تک رہتا ہے۔ نخلستان ادب میں کالج سے طلباء کے علاوہ دیگر مشاہیر ریاست بھی اپنا کلام اس میں شائع کراتے ہیں۔ جن میں محسن الملک، مولوی غلام حسین صاحب، مولوی عبدالمالک صاحب مشیر مال، ارشاد نبی ارشاد، سجادی زار، مولوی نصیرالدین خرم، مولوی عزیز الرحمٰن عزیز، محسن خانپوری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس گمنام دور میں ادارت واشاعت قابل تحقیق ہیں۔☆

پروفیسر عبدالستار نیازی اپنے مضمون ''اُردو زبان وادب میں نخلستان ادب کا

☆ سہ ماہی ''الذبیر'' بہاول پور۔ بہاول پور کا سوسالہ صحافت نمبر شمارہ ۱۔ ۱۹۸۴ء ص ۲۶

کردار'' میں لکھتے ہیں:

''مشتاق احمد زاہدی (قرۃ العین حیدر کے ماموں یا خالو) ۱۹۲۲ء میں اس کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے اُنہوں نے طالب علموں کی فکرونظر کی پرورش کے لیے The OASIS کے نام سے ایک سہ ماہی مجلّے کا اجراء کیا۔ نخلستان ادب ''دی اوسس'' کا ہی اُردو ترجمہ ہے یہ مجلّہ انگریزی، ہندی تینوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا☆۔

محمد اختر فرحت نے اپنے مضمون ''اُردو ادب کے فروغ میں بہاول پور کے تعلیمی اداروں کے رسائل وجرائد کا کردار میں لکھا ہے'' اگر ہم بہاول پور کے تعلیمی اداروں کے رسائل وجرائد کی طرف دیکھیں تو ہماری نگاہ ایس ای کالج کے شہپر ادبی رسالے ''نخلستان ادب'' کے اولین شمارے پر جا رُکتی ہے۔ نخلستان ادب کا پہلا شمارہ ۱۹۲۳ء میں زیب نظر بنا'' ☆☆۔

اسی طرح زاہدا قبال اپنے مضمون ''ضلع بہاول پور کے رسائل وجرائد میں لکھتے ہیں'' نخلستان ادب گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کا ادبی مجلّہ ہے اس کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۱۲ء میں منصۂ شہود پر آیا'' ☆☆☆۔

ڈاکٹر رب نواز کاوش اپنے مضمون'' بہاول پور کے اُردو ادب کا مختصر جائزہ'' میں نخلستان ادب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں'' صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کا علمی وادبی

☆ نخلستان ادب پاکستان گولڈن جوبلی نمبر ۱۹۹۷ء ص ۳۰

☆☆ سہ ماہی ''الزبیر'' بہاول پور شمارہ ۳۔ ۲۰۰۱۔ ص ۵۲

☆☆☆ پیش منظر گورنمنٹ ڈگری کالج حاصل پور افتتاحی شمارہ ۲۰۰۳ء ص ۷۰

مجلّہ ''نخلستان ادب ۱۹۲۲ء کو سہ ماہی کے طور پر شائع ہونا شروع ہوا'' (۱)۔

نخلستان ادب کا اجراء کب ہوا، اس کے پہلے ایڈیٹر کون تھے، یہ ایسے سوالات ہیں جن پر بہت سے مقامی ادیبوں، کالج کے ساتذہ، پرنسپل صاحبان اور اس مجلّہ کے نگران اساتذہ نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے اکثریت کی رائے یہ ہے کہ یہ مجلّہ ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا۔ مثلاً

نخلستان ادب ۱۹۷۲ء کے سرورق پر بھی جاری شدہ ''۱۹۱۲'' کے الفاظ درج ہیں (۲)۔ اس کے علاوہ ادب کے شمارہ ۱۹۷۶ء کے سرورق پر بھی ''جاری شدہ ۱۹۱۲'' کے الفاظ درج ہیں (۳)۔

جناب عبدالحمید ارشد صاحب جو ایک معروف شخصیت ہیں ان کا کہنا ہے۔

''۱۹۱۲ء میں اس کالج کا مجلّہ ''نخلستان ادب شائع ہوا'' انگریزی حصے کا نام (OASIS) تھا۔'' (۴)

اس طرح سید مشہود حسن رضوی مجلّہ ''الذبیر'' میں لکھتے ہیں۔

''۱۹۱۲ء میں صادق ایجرٹن کالج نے اپنا سالانہ میگزین نکالنا شروع کیا اور اوس کا نام نخلستان ادب رکھا۔'' (۵)

---

(۱) پیش منظر گورنمنٹ ڈگری کالج حاصل پور افتتاحی شمارہ ۲۰۰۳ء ص ۱۰۶ء
(۲) مجلّہ ''نخلستان ادب'' ۱۹۷۲ء ساٹھ سالہ نمبر
(۳) مجلّہ ''نخلستان ادب'' ۱۹۷۶ء قائداعظم نمبر
(۴) مجلّہ ''نخلستان ادب'' ۱۹۷۲ء ساٹھ سالہ نمبر۔ ص ۲۸
(۵) مجلّہ ''الذبیر'' سوسالہ صحافت نمبر ۱۹۸۴ء۔ ص ۱۲

پروفیسر دلشاد کلانچوی مجلّہ ''الذبیر'' کے سوسالہ صحافت نمبر میں لکھتے ہیں۔

''صادق ایجرٹن کالج بہاولپور میں ۱۹۱۲ء سے مجلّہ
نخلستان ادب کا اجراء ہوا۔''(۱)

اسی طرح مسعود حسن شہاب دہلوی کے خیال میں

''۱۹۱۲ء میں صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کا ترجمان
نخلستان ادب جاری ہوا۔ جس میں کالج کے طلباء اور
اساتذہ کے مضامین نظم ونثر شائع ہوتے تھے''۔(۲)

ان تمام حضرات کے خیالات اپنی جگہ پر اہمیت کے حامل ہیں۔لیکن مختلف اساتذہ اور اہل قلم سے براہ راست گفتگو اور تحقیق کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس مجلّہ کا آغاز ''اپریل ۱۹۲۳ء'' میں ہوا۔ کیونکہ انور صابر صاحب جو ''نخلستان ادب'' کے ۱۹۸۶ء میں نگران رہے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''نخلستان ادب کا پہلا شمارہ ۱۹۲۳ء میں منصۂ شہود پر
آیا۔ اور تادم تحریر نخلستان ادب کے کل ۴۵ شمارے
دستیاب ہوسکے''۔(۳)

بہاول پور کی معروف علمی وادبی شخصیت ،نورالزمان اوج صاحب کا کہنا ہے۔

''نخلستان ادب کا اجراء اپریل ۱۹۲۳ میں ہوا اور اس کا پہلا شمارہ
میرے پاس موجود ہے۔''(۴)

---

(۱) مجلّہ ''الذبیر'' سوسالہ صحافت نمبر ۱۹۸۴ء۔ص ۴۷

(۲) مسعود حسن شہاب ''بہاولپور میں اردو'' ۱۹۸۳ء۔ص ۱۴۷

(۳) مجلّہ ''نخلستان ادب'' ۱۹۸۶ء انتخاب نمبر۔ص ۶

(۴) گفتگو مقالہ نگار میر انورالزمان اوج صاحب

انہوں نے اس بات کو رد کرتے ہوئے کہ ۱۹۱۲ء میں مجلے کا آغاز ہوا، کہا کہ اس کا اجراء ۱۹۲۳ء میں ہی ہوا۔ ۱۹۱۲ء والی بات کو انہوں نے کلی طور پر رد کیا۔ اس بات کا یقین اس لیے بھی ہو جاتا ہے کہ ۱۹۲۳ء سے پہلے کا کوئی شمارہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس کے علاوہ سید عارف صاحب جو کہ صادق ایجرٹن کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں اسی بات کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''نخلستان ادب'' کا اجراء ۱۹۲۳ء سے ہی ہوا۔ نور الزمان اوج صاحب کے پاس ۱۹۲۳ء کا پہلا شمارہ موجود ہے۔ اس شمارے کے اُردو اداریے میں جو عبارت درج ہے اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

> '' سال گزشتہ کے اولڈ بوائز'' ڈنر کا حال انگریزی حصے میں مجملاً لکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے چونکہ کالج میگزین کا اجراء نہ ہوا تھا۔ اس لیے کالج کے حالات کی اشاعت کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اب چونکہ حضور سرکار معلی دام اقبالہ کی فیاض اور دریا دلی سے کالج کی یہ کمی بھی پوری ہوگئی ہے۔ اس لیے گو مضمون پرانا ہوگیا ہے لیکن ناظرین کے لیے تازہ ہوگیا ہے۔''(۱)

اس کے علاوہ نخلستان ادب کے اپریل ۱۹۲۳ء کے شمارے کے انگریزی حصے کے اداریے بعنوان (OUR DUBUT) میں بھی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اپریل ۱۹۲۳ء کے شمارے میں (Editorial Notes and Comments) کے عنوان سے جو عبارت درج ہے اس سے بھی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ نخلستان ادب کا اجراء اپریل ۱۹۲۳ء میں ہی ہوا۔ ان تمام باتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجلّہ نخلستان ادب جس کے انگریزی حصے کا نام (OASIS) ہے کا اجراء اپریل ۱۹۲۳ء سے ہی ہوا تھا۔

---

(۱) مجلّہ ''نخلستان ادب'' اپریل ۱۹۲۳ء۔ص ۳

اسی طرح محمد علی درویش نے اپنے مضمون ''صحافت بہاول پور میں'' میں نخلستان ادب کا سنہ اجراء ۱۹۱۲ء دیا ہے۔ (الذبیر بہاول پور: بہاول پور کا صد سالہ صحافت نمبر ۔ص ۲۴۳)۔ سیمحہ عبید الرحمٰن نے اسی نمبر میں اپنے مضمون ''بہاول پوری صحافت کا سرسری تذکرہ'' میں لکھا ہے ''ایس ای کالج کی طرف سے ۱۹۱۲ء میں'' نخلستان ادب کے نام سے ایک میگزین نکالنا شروع کیا گیا کیونکہ اس کالج میں علم دوست اور ادب نواز معلمین تدریسی فرائض سرانجام دینے کے لیے

اسی طرح سید مشہود حسن رضوی نے اپنے مضمون ''بہاول پور کی اُردو صحافت ایک اجمالی جائزہ'' میں لکھا ہے۔

''۱۹۱۲ء میں صادق ایجرٹن کالج بہاول پور نے اپنا
ایک سالانہ میگزین نکالنا شروع کیا اور اس کا نام
نخلستان ادب رکھا'' (ص ۔۱۲)

شہاب دہلوی، عبدالحمید ارشد، دلشاد کلانچوی اور معین الدین حسن قریشی کے بیانات سے اتفاق کرتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ نخلستان ادب کا اجراء ۱۹۱۲ء میں ہوا تھا اور پھر ۱۹۷۲ء میں ہوا تھا اور پھر ۱۹۷۲ اور ۱۹۷۶ کے نخلستان ادب کے سرورق پر جاری شدہ ۱۹۱۲ء تحریر ہے علاوہ ازیں اسی مناسبت سے پچاس سالہ نمبر اور ساٹھ سالہ نمبر نکالا گیا ہے البتہ تحقیق میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی اس لیے اس پر تحقیق جاری رہنی چاہیے۔

(۳)

نخلستان ادب کے سارے شمارے دستیاب ہیں اور کالج کی لائبریری میں بھی مکمل ریکارڈ نہیں ملتا تاہم جو پرچے موجود ہیں وہ مختلف اشخاص کے پاس بھی ہیں اور

سنٹرل لائبریری بہاول پور میں بھی ہیں البتہ ان میں سے کوئی شمارے غائب ہیں اس ریکارڈ کو یہاں اس لیے درج کیا جاتا ہے تاکہ ان کی تلاش وجستجو کے سلسلے میں معاون ...ت ہوسکے۔

نخلستان ادب

(بہاول پور میں موجود ریکارڈ مختلف اداروں میں)

(۱) گورنمنٹ ایس۔ای۔کالج کی لائبریری میں:

(۱)	اکتوبر ۱۹۳۱ء	(۲)	فروری ۱۹۳۳ء
(۳)	اکتوبر ۱۹۴۰ء	(۴)	مارچ ۱۹۴۳ء
(۵)	بہار نمبر ۱۹۴۷ء	(۶)	اپریل ۱۹۵۰ء
(۷)	مارچ ۱۹۶۰ء	(۸)	شمارہ ۱۹۶۲ء
(۹)	شمارہ ۱۹۶۳ء	(۱۰)	شمارہ ۱۹۶۷ء
(۱۱)	بہار ۱۹۶۷ء	(۱۲)	جنوری ۱۹۷۰ء
(۱۳)	ساٹھ سالہ نمبر ۱۹۷۲ء	(۱۴)	شمارہ ۱۹۷۳ء
(۱۵)	قائد نمبر ۱۹۷۶ء	(۱۶)	اقبال نمبر ۱۹۷۹ء
(۱۷)	شمارہ ۱۹۷۱ء	(۱۸)	جنوری ۱۹۸۲ء
(۱۹)	شمارہ ۱۹۸۵ء	(۲۰)	انتخاب نخلستان ۱۹۸۶ء
(۲۱)	صد سالہ نمبر ۱۹۸۹ء	(۲۲)	پاکستان گولڈن جوبلی نمبر ۱۹۸۷ء
(۲۳)	نیو ملینیم ۲۰۰۰	(۲۴)	قائداعظم نمبر ۲۰۰۳ء
(۲۵)	خواجہ فرید نمبر ۲۰۰۶ء		

(۲) سنٹرل لائبری میں

(۱)	شمارہ ۱۹۳۰ء	(۲)	شمارہ ۱۹۴۰ء
(۳)	شمارہ ۱۹۴۳ء	(۴)	شمارہ ۱۹۵۰ء
(۵)	شمارہ ۱۹۵۳ء	(۶)	شمارہ ۱۹۵۴ء
(۷)	شمارہ ۱۹۵۵	(۸)	شمارہ ۱۹۶۱ء
(۹)	شمارہ ۱۹۶۲ء	(۱۰)	شمارہ ۱۹۶۲ء
(۱۱)	مارہ ۱۹۶۸ء	(۱۲)	شمارہ ۱۹۶۸ء
(۱۳)	شمارہ ۱۹۷۲ء	(۱۴)	شمارہ ۱۹۷۳ء
(۱۵)	شمارہ ۱۹۸۵ء	(۱۶)	انتخاب نخلستان ۱۹۸۶ء
(۱۷)	صد سالہ نمبر ۱۹۸۶ء		

(۳) نور الزمان اوؔج صاحب کی نجی لائبریری میں:

(۱)	اپریل تا جون ۱۹۲۳ء	(۲)	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۲۳ء
(۳)	جنوری تا مارچ ۱۹۲۴ء	(۴)	اپریل تا جولائی ۱۹۲۴ء
(۵)	ستمبر ۱۹۳۵ء	(۶)	ستمبر ۱۹۳۸ء
(۷)	جنوری ۱۹۳۶	(۸)	اکتوبر ۱۹۳۹ء سالنامہ
(۹)	مارچ ۱۹۴۳ء	(۱۰)	اکتوبر ۱۹۴۰ء
(۱۱)	اپریل ۱۹۳۷ء سالنامہ	(۱۲)	جنوری ۱۹۳۸ء
(۱۳)	بہار نمبر ۱۹۴۷ء	(۱۴)	جنوری ۱۹۳۹ء
(۱۵)	اقبال نمبر ۱۹۴۱ء		

نخلستان ادب کے مختلف شماروں کا مطالعہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کا معیار بہت بلند تھا اور اس کا اندازہ نگرانوں اور مدیروں کی فہرست سے بھی لگایا جا سکتا

ہے اور پھر کالج میں ایسے اساتذہ بھی موجود تھے جن کی ادبی حیثیت اور علمی مقام و مرتبے کی وجہ سے اور ان کی توجہ کی بنا پر ہر شمبارہ کسی نہ کسی حوالے سے یادگار ہے اس عظیم درسگارہ میں جن نامور اساتذہ کرام نے تدریسی خدمات سرانجام دیں ان میں پروفیسر عبدالحمید، پروفیسر جمعیت علی، لالہ رام رتن، مرزا محمد اشرف گورگانی، معین الدین قریشی، پروفیسر منور علی خان، عابد صدیق، پروفیسر سہیل اختر، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، پروفیسر پیرزادہ عبدالرشید، پروفیسر مشتاق احمد زاہدی، پروفیسر شجاع ناموس منعمی، دلشاد کلانچوی، اسلم انصاری، حسین سحر، اسد اریب، نعمت الحق اور بہت سے دوسرے شامل ہیں اور اب بھی ڈاکٹر انور صابر، ڈاکٹر رب نواز کاوش، ڈاکٹر زوار حسین شاہ، پروفیسر محمد طاہر اور ڈاکٹر آفتاب حسین گیلانی ایسے ادباء موجود ہیں جو طلبہ کی ادبی صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور ان کی رہنمائی کے لیے موجود ہیں علاوہ ازیں اس کالج میں ایسے طلبہ بھی تعلیم حاصل کرتے رہے جنہوں نے بعد میں ادب میں بڑا نام پیدا کیا ان میں احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، ڈاکٹر محمد باقر، محمد خالد اختر، محمد کاظم، رفیق خاور جسکانی، ڈاکٹر نصر اللہ خاں ناصر، خورشید ناظر، ڈاکٹر شاہد حسن رضوی، ڈاکٹر اسد فیض، نورالزمان اوج، نیاز حسین لکھویرا، وقار عزیز صدیقی، محمد اسلم ملک، منور عثمانی۔ اس سلسلے میں کئی اور نام بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔

نخلستان ادب کی اشاعت کے بعد ظاہر ہے اس کے بارے میں تبصرے بھی ہوئے ہوں گے اور کالج میگزین کو سراہا بھی گیا ہوگا اور اس کے مندرجات کے بارے میں اظہار خیال بھی کیا گیا ہوگا۔ اس سلسلے میں تلاش کے بعد جو کچھ مجھے ملا ہے اس میں نخلستان ادب کو بہاول کے کالجوں کا سب سے معیاری مجلّہ قرار دیا گیا ہے اور جس طرح کی بھی ادبی خدمت اس نے کی ہے اس کو سراہا بھی گیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اس سلسلے کے مضامین کی فہرست اسطرح سے ہے۔

نخلستان ادب کے بارے میں محمد خالد اختر کے مضمون سے ایک اقتباس دیکھیے۔

''میری جتنی بھی انگریزی کہانیاں ''اوسس'' میں چھپیں۔سب پہلے پہلے سولجرز کے پندرہ روزہ اجلاسوں میں پڑھی گئیں۔ پہلی کہانی جو میں نے سولجرز کی میٹنگ میں پڑھی گوسٹ آف اے پائیریٹ (GROST OF APIRATE) تھی جسے پیرزادہ رشید نے بے حد سراہااور مجھ سے ''اوسس'' میں چھاپنے کے لیے لے لیا۔ دوسری دو کہانیاں بھی سمندری قزاقوں اور جہازوں

کے بارے میں تھیں اور مجھے یاد ہے ان میں سے ایک نے ''اوسس'' کے صفحات میں جگہ پائی۔ میری ایک انگریزی میں لکھی ہوئی کہانی ''صبوحی'' تو سولجرز کے اجلاس میں بڑی مقبول ہوئی۔ پیرزادہ صاحب نے اس رومانی لوسٹوری کی بہت تعریف کی (اوران کی اس تعریف سے میں خوشی سے پھولا نہ سمایا) مگر بعد میں انہوں نے چند انگریزی الفاظ کے تلفظ کی غلطیاں بھی جتادیں جو میں نے پڑھنے میں کی تھیں (میں آسمان سے زمین پر آرہا) یہ کہانی (جو اوسس میں دھوم دھام سے چھپی) ایک لڑکے احمد شاہ کو بہت پسند آئی۔ یہ احمد شاہ ضلع خوشاب کے ایک پیرگھرانے کا صحت مند لڑکا تھا۔ نکلتا ہوا قد، چوڑے ہاتھ پاؤں، سرخی مائل تیکھا چہرہ ہونٹ کے گوشے سے تھوڑی تک کسی تیز آلے کے گھاؤ کا چکتا۔ بانکی طرے دار پگڑی اور اچکن والا احمد شاہ ایک پیدائشی شاعر تھا۔ ان لوگوں میں سے جو دنیا میں خوبصورت گیت لکھنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ 'صبوحی' کا نام اسے اتنا بھایا کہ وہ اس کی نظموں اور قطعات کی دیہاتی عورت بنی۔ میں اور احمد شاہ جو ندیم تخلص کرتا تھا، بڑے گہرے دوست بن گئے۔ اگر میں لاہور سے بہاول پور نہ آتا اور 'سولجرز' میں نہ ہوتا تو شاید ہم ایک دوسرے کے قریب نہ آپاتے۔ 'سولجرز' میں میں ایک اور غیر معمولی ذہن کے مالک شخص سے بھی ملا جو آخری سال میں گروپ کا سیکرٹری ہوا۔ ان کا نام ضیاء الحق تھا۔ گداز طبیعت

سمندر کی طرح وسیع دل، بلا کا خوش گفتار، انسان دوست ان
اوصاف کے ساتھ وہ نہایت شکیل وجمیل نوجوان تھا۔ اور جب
وہ اپنی اونچے شملے والی پگڑی، بے شکن اچکن اور طلے دار جوتی
میں خراماں خراماں چلتا تو وہ فی الواقع انسانوں میں ایک
شہزادہ دکھائی دیتا۔ ندیم اور ضیاء دونوں میرے عمر بھر کے
دوست بن گئے۔ ندیم کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ ضیاء
کو کوئی نہیں جانتا مگر دونوں نابغۂ روزگار ہستان ہیں مجھے ان کی
دوستی پر فخر ہے''۔

جہاں تک مجھے یاد ہے کالج میگزین کے اُردو کے سیکشن میں چار سال کے عرصے میں میری صرف دو چار چیزیں چھپیں۔ وہ ڈولے اور سٹیلے ورمن کے ناولوں سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھیں مگر تھیں بالکل اوریجنل میرے دوستوں کو وہ خوب دلچسپ لگیں مگر ان سب نے مجھ سے کہا 'بھئی سچ سچ بتاؤ۔ تم نے انہیں کہاں سے ترجمہ کیا'۔ دراصل ان کہانیوں کی سیٹنگ (Setting) لوکیل (LOCALE) کردار وغیرہ سب بدیشی (فارن) تھے۔ کوئی اور ایسی کہانیاں لکھتا تو میں بھی انہیں ترجمہ کہتا۔ اس پر مستزاد میری انگریزی اُردو۔ اردو تب مجھے آتی نہیں تھی اور اب بھی ساری عمر جھک مارنے کے بعد نہیں آئی۔ اتنے سال اُردو زبان لکھنے کی مشق کرنے کے باوجود ابھی تک اس میدان میں گھٹنوں کے بل چلتا ہوں۔ اور معمولی سا مفہوم بھی بلا تکلف اور صفائی سے اُردو میں ادا نہیں کر سکتا۔ بہر حال اوس (اور نخلستان ادب) میں میری چھپی ہوئی نگارشات نے مجھ میں رائٹر اور لٹریری میں ہونے کا زعم ضرور پیدا کر دیا۔ اور کالج میگزین ہی میں میں نے اپنے نام کو چھپا ہوا دیکھا۔

میرا خیال ہے میرے وقتوں میں کالج میگزین کے مندرجات کا معیار اتنا گیا گزرا نہیں تھا۔ ندیم اور افسوں کی نظمیں تو بہت اچھی ہوتی تھیں (کئی سال ہوئے افسوں

وفات پا گئے) نخلستان ادب میں ثریصامین، افسانے وغیرہ بالعموم بڑی شاعرانہ رنگین زباں میں ہوتے تھے کہ اس وقت اسی طرز کا رواج تھا ہمایوں، عالمگیر، ادب لطیف جیسے پائے کے ادبی رسالوں میں کئی لکھنے والے ایسی ہی زبان لکھتے تھے اور فصاحت و بلاغت کے دریا لنڈھاتے تھے۔ ان کی واہ واہ بھی ہوتی تھی وہ نیاز فتح پوری، فلک پیا، آغا حشر کاشمیری کا دور تھا۔ کالج میگزین میں جواں سال ادیب گران ثقہ انشا پردازوں کی پیروی میں رنگین بیانی کی طرف مائل تھے تو ہم ان کو الزام نہیں دے سکتے۔ ویسے کالج میگزین سے بہت اونچے ادبی معیار کی توقع نہیں کی جانی چاہیے۔

ایک اور بات یہ تھی کہ کالج کے پروفیسر اور لیکچرار بھی 'اوسں' یا نخلستان ادب میں لکھنے سے کئی کتراتے ممکن ہے وہ لونڈوں اور طالب علموں کے میگزین میں چھپنا کسرِ شان گمان کرتے ہوں یا اُن کے پاس کہنے کے لیے کوئی خاص بات نہ ہو۔ پی۔اے رشید جیسے سکالر اور ڈاکٹر ایف ایم شجاع منعمی جیسے ادبی 'شیر' بھی اپنے رشحاتِ قلم سے اپنے کالج کے میگزین کو محروم رکھتے۔ حالانکہ احمد بخاری پطرس، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور گورنمنٹ کالج لاہور کے دوسرے پروفیسر وقتاً فوقتاً اپنے کالج میگزین 'راوی' میں لکھتے رہتے تھے۔ 'راوی' کے ادبی معیار کے دوسرے کالجوں کی میگزینوں سے قدرے بہتر ہونے کی وجہ یہ بھی تھی۔

'اوسں' یاں نخلستان ادب سال میں ایک بار ہی چھپتا تھا۔ شاید کبھی ایک سال میں دو شمارے آ گئے ہوں۔ میری طالب علمی کے چہار سالوں میں انگریزی حصے کے نگران تو پی۔اے رشید ہوتے تھے اور اُردو حصے کے پروفیسر صادق علی جو اپنے نام کے آگے ریسرچ سکالر فارڈی لٹ لکھا کرتے تھے۔ ایڈیٹر اور سب ایڈیٹر کئی گئے اور آئے۔ انگریزی اور اُردو حصوں کے ادارتی بورڈ الگ الگ ہوتے تھے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میں کبھی 'اوسں' کا ایڈیٹر یا سب ایڈیٹر نہیں بنا۔ ندیم کے بارے میں میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی تعلیم کے آخری سال میں 'نخلستان ادب' کے ایڈیٹر بنے یا نہیں (وہ مجھ سے

دو سال سینئر تھے) میرے کئی دوست غلام ربانی، معین الدین حسن، سردار محمد ایوب مرحوم، اندر بھان کا کسی نہ کسی سال میں کالج میگزین کے ادارتی بورڈ سے منسلک ہوئے۔ ان دونوں انگریزی اور اُردو حصوں کیساتھ ایک ہندی کا حصہ بھی ہوتا تھا۔ جس کے انچارج سنسکرت کے کوئی مہاشے پروفیسر تھے۔

ایک طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہاول پور میں 'اوسس' یا نخلستان ادب پہلا خالصتاً ادبی رسالہ تھا جس میں معیار سے قطع نظر ادبی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ میں کالج کے تیسرے سال میں تھا جب پروفیسر ایف۔ ایم شجاع منعمی نے بہاولپور سے ایک 'باقاعدہ' ادبی ماہنامے 'محقق' کا آغاز کیا۔ میں نے بھی 'محقق' کے لیے دو تین کہانیاں لکھیں۔ مگر اس رسالے کو پروفیسر صاحب زیادہ دیر تک نہ چلا سکے اور یہ پانچ چھ شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں 'محقق' کا ادبی معیار بھی کالج میگزین 'نخلستان ادب' سے کسی طور بہتر نہ تھا اور اس کے بعد ہو جانے سے اردو ادب کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا۔

اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد بہاول پور کے آنے پر مجھے پچھلے چند ایک سالوں کے 'نخلستان ادب' کے پرچے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ انگریزی حصہ 'اوسس' اور ہندی حصہ اب اس کے ساتھ شائع نہیں ہوتے اور یہ اب خالصتاً اردو کا میگزین ہے جو سال یا دو سال میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔ ''نخلستان ادب' کا ادبی معیار یقیناً ہمارے وقتوں سے بہتر ہوتا ہے مگر مجھے کچھ کچھ یہ تاثر ہوا کہ یہ طالب علموں سے زیادہ اب پروفیسر صاحبان کا میگزین بن رہا ہے جس میں معلموں اور پرانے طالب علموں (اولڈ بوائز) کی نگارشات کثرت سے ہوتی ہیں۔ میری رائے میں کالج میگزین کو نوجوان طالب علموں کی ہی ناپختہ ادبی کاوشوں اور ذہنی نکاس کے لیے وقف رہنا چاہیے۔ کیونکہ کالج میگزین ہوتا ہی اس لے ہے 'معیاری' ادب کی اشاعت کے لیے تو لاہور، کراچی اور دوسرے شہروں سے کئی رسالے نکلتے ہیں۔

نورالزماں اوج نے اپنے مضمون میں جس طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کچھ اسطرح سے ہیں۔

بہاول پور کے ایک اور علمی جمیدہ جس کا ذکر ناگزیر ہے وہ صادق ایجرٹن کالج کا مجلّہ نخلستان ادب ہے جو پہلے بیک وقت تین زبانوں یعنی انگریزی، ہندی اور اُردو میں شائع ہوتا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد ہندی سیکشن بند کر دیا گیا یہ سیکشن یہاں کی اقلیت کے لیے سابق ریاست بہاول پور کی وسعت القلبی اور مذہبی رواداری کی زندہ مثال تھا۔ یہ جریدہ کالج کی سو سالہ زندگی کا ہم عصر بھی ہے اور اس لحاظ سے بہاول پور کا سب سے پرانا رسالہ ہے جو باقاعدگی کیساتھ تو نہیں لیکن اپنے سو سالہ زندگی کے ہر دور میں کبھی نہ کبھی شائع ہوتا ہی رہا۔ چونکہ زیادہ تر طالب علموں کے مضمونوں پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے اس کے ہر پرچے کو معیاری تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اپنی اولیت کی بنا پر اس کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوتی۔

دوسری بات جو اس پرچے کو دیگر رسالوں سے ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ بہاول پور کے تمام ادیبوں کی ابتدائی تحقیقات کا عکاس ہے اور کچھ ان بیرونی ادیبوں کے نگارشات کا بھی جن کے والدین بہاول پور سے وقتاً فوقتاً بسلسلۂ ملازمت یا کاروبار منسلک رہے اور بعد میں چلے گئے۔ بعض لکھنے والے وہ بھی تھے جو بوجہ غربت بہاول پور کی مفت تعلیمی سہولیات سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے تعلیمی کیریر تک ایس ای کالج سے وابستہ رہے۔

برصغیر کے ممتاز ادیب جناب احمد ندیم قاسمی بھی اسی کالج کے فارغ التحصیل ہیں۔ اور ان کے ابتدائی افسانوں اور دیگر تخلیقات کا عکس نخلستان کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر اُن کے ایک مزاحیہ مضمون ''ریاستی کالج'' سے یہ تاثر قائم ہوا کہ انہوں نے بہاول پور کے تمدن کا مذاق اڑایا ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں وہ ایک ادبی مذاق تھا اور بس۔ جناب احمد ندیم قاسمی نے بہاول پور سے اپنی قلبی وابستگی کا صحیح اظہار پریشان جلوے میں مندرجہ ذیل سطروں میں کیا ہے۔

''بہاول پور سے میرا تعلق کئی وجوہ سے نہایت اہم ہے۔
بہاول پور میں میں نے شاعری اور افسانہ نگاری کی ابتدا کی۔
بہاول پور میں اول میں نے نوجوانی کا مخمور کن عطر محسوس کیا اور
مجھے معلوم ہوا کہ باوجود شواریوں کے زندگی زندہ رہنے کے
لیے ہے۔''

بہاول پور میں میری تعلیم کی آخری منزل ہے۔

بہاول پور میں مجھے محمد خالد اختر ایسا دوست میسر آیا جس نے مجھے افسانے لکھنے کی ترغیب دی اور میرا یہ یقین پختہ کر دیا ہے کہ اس زمانے میں مخلص اور بے لوث دوستوں کا قحط محض فسانہ ہے اس راکھ میں ابھی تک کئی شرارے پوشیدہ ہیں۔ بہاول پور میں مجھے ایک ایسے بے مثل انسان کی نیازمندی کا فخر حاصل ہوا۔ جو میرے استاد بھی تھے۔ دوست بھی، ہمدرد رہنما بھی اور یہ ہیں صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کے موجودہ پرنسپل پیرزادہ عبدالرشید صاحب۔ بہاول پور سے مجھے اس لیے بھی محبت ہے اور عقیدت بھی وہ لمبی لمبی کھجوروں اور سنہری ٹیلوں والی دل آویز سرزمیں!''

ان کی اس تحریر کے بعد ان پر بہاول پور دشمنی کا الزام کبھی عائد نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہی اُن جیسے حساس ادیب سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔

نخلستان ادب کے پرچے جن دیگر ادیبوں کے ابتدائی نگارشات سے مزین ہوتے رہے ان کے نام (بشمول سکھ اور ہندو ادیبوں) فضیل میرزا، اختر منیر، پروفیسر شجاع منعمی، پروفیسر صادق علی، پیر زادہ عبدالرشید، پروفیسر مہتہ مرلی دھر، ضیاء الدین احمد، مولوی غلام حسین، حافظ سراج الدین محمود، افسوں انصاری، کنور حمید اللہ خاں، عبدالقار جوہر، پروفیسر معین الدین حسن، پروفیسر غوث محمد شاہ، ڈاکٹر محمد ساجد، نشتر غوری، عزیز خاں، میرزا سیف اللہ فاروق، منظور الٰہی، شمن گوگارنی، عنایت حسین شاہ بخاری،

سید شبیر بخاری، منیر، جی اے پانی، احمد علی سیف، حکیم شمس الحسن صدیقی، علی محمد خان ڈہر، جمیل میرزا، فاروق ناصر، خاور جسکانی، عباس مشہدی، عبدالحمید ارشد، عبدالباسط ناز، جسٹس محمد اکبر خان، محمد نواز شہید، محمد مظہر، جہانگیر خان ہوتیانہ، اظہار نبی، قریشی فتح محمد خان، ایم ایس اے گاندھی، ہرگوبند سنگھ، ربانی کشن چند، رادھا کرشن اور جگت موہن اپنے طالب علمی کے زمانے میں جناب احمد ندیم قاسمی اور جناب خالد اختر بھی اس جریدے کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔

نخلستان ادب کے اُردو سیکشن میں تحریر کردہ بعض ہندو سکھ ادیبوں کی اردو نگارشات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بہاول پور کے تمدن میں اردو زبان کو کتنا عمل دخل تھا۔ نہ صرف اردو بلکہ فارسی بھی غیر مسلموں کی محبوب زبان تھی۔ اور بہاول پور کے بہت سے قدیم ہندو شعراء فارسی میں شعر کہتے تھے۔ بہاول پور کی سب سے پہلی دو تاریخیں مرأت دولت عباسیہ اور اقبال نامہ فارسی ہی میں لکھی گئی تھیں اور ان کا مصنف بھی ایک ہندو تھا۔ لالہ دولت رائے ۱۹۴۷ء میں نخلستان ادب کا جنگ نمبر شائع ہوا تھا اور یہ میری پہلی ادارتی ذمہ داری تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ نمبر حکومتی پالیسی کے تحت شائع ہوا تھا جس میں زیادہ تر زور بیان ہٹلر کے خلاف تھا۔ بہر کیف میں نے اس پرچے کی ادبی حیثیت کو بھی مجروح نہیں ہونے دیا اور کوشش کی کہ پراپیگنڈے کے باوجود اس کی ادبی انفرادیت قائم رہے۔ اسی سلسلے میں ایک لطیفہ بھی سنتے چلئے۔ محترم سید عباس انور شاہ اس شمارے کے لیے ایک منظوم کہانی عنایت کی۔ کہانی کا نام مجھے یاد نہیں اس کا صرف ایک شعر یاد ہے۔

امی بتا بتا میر ابو کہاں گئے
آخر وہ کس کی دھن میں سوئے آسماں گئے

یہ کہانی دراصل احمد ندیم قاسمی کی تھی۔ میرے علم میں نہیں تھی۔ اس لیے بے خبری میں سید عباس انور شاہ کے نام شائع ہوگئی۔ چھپنے کے بعد انکشاف ہوا تو ندامت ہوئی۔

بہرکیف بچپنے میں ایسی غلطیاں ہو ہی جایا کرتی ہیں ۔ میرا پہلا ڈرامہ بھی نخلستان ادب کے جنگ نمبر میں شائع ہوا۔

دلشاد کلانچوی نخلستان ادب کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

۱۹۳۴۔۳۵ء میں نخلستان ادب کا معیار کافی تسلی بخش تھا۔ اس سال اس کے طالب علم مدیر پیرزادہ احمد شاہ ندیم قاسمی تھے ۔ ان کے علمی ادبی ذوق رکھنے والے ان کے طالبعلم ساتھی بھی اچھی تعداد میں تھے ۔ جنہوں نے اس مجلّے میں اپنی ابتدائی تحریریں شامل کرائیں ۔ ایسے طالب علموں میں سکندر علی وجد، خالد اختر، امین حزین، شمن گوگانی جیسے آج کے نامور ادیب شامل تھے ۔

۱۹۳۵ء میں جب احمد ندیم قاسمی یہاں سے بی ۔ اے کر کے جا رہے تھے تو میں نے اسی کالج میں فرسٹ ائیر میں داخلہ لیا۔ اس سال رسالہ نخلستان ادب کے ایڈیٹر رانا منور الٰہی بنے ۔ ان کے بعد رانا سردار احمد سعید اس کے ایڈیٹر بنے ۔ ۱۹۳۷ء میں جب میں بی ۔ اے میں آ گیا تو مجھے اس مجلّہ کی ادارت سونپ دی گئی ۔ میرے لیے یہ ایک بڑا اعزاز تھا۔ میں اس اعزاز کی لاج رکھنے میں لگ گیا۔ سب سے پہلے اس مجلّہ کی پیشانی پر یہ مصرع ثبت کرایا۔

طرح نو افگن کے ماجدت پسند افتادہ ایم

رسالے کا دور جدید قائم کیا۔ اس دور جدید کا پہلا شمارہ ستمبر ۱۹۳۸ء میں آب وتاب سے شائع کیا۔ اسی سال ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانے والے علامہ محمد اقبال کے لیے اس شمارے میں ایک گوشہ وقف کیا۔ جس میں مرحوم کی خدمت میں منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا۔ اور ان سے متعلق موضوعات پر مقالے شائع کیے گئے ۔

اسی شمارے میں جناب احمد ندیم قاسمی کی نظم ''گزرے ہوئے دن'' شامل ہے ۔ یہ نظم خاص طور پر مجلّہ نخلستان ادب کے لیے منگوائی گئی ۔ معلوم نہیں یہ نظم ان کے کسی مجموعے

میں شامل بھی ہے یا نہیں بہرحال ان کے اس دور کے طرز کلام سے لطف اندوزی کی خاطر دو بند یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

گزرے ہوئے دن گزرے ہوئے دن　　　کچھ خواب تھے آئے بیت گئے
سچ بات سے کیوں انکار کروں　　　میں ہار گیا، تم جیت گئے
معصوم جوانی کی راتیں　　　بادل تھے کہ چھا کر چھٹ گئے
وہ تیری عنایت کے لمحے!　　　سائے تھے کہ بڑھ کر ہٹ گئے

متفرق مضامین سے ''مرزا غالب'' سابق ایڈیٹر رانا سردار احمد سعید کا ایک اچھا مضمون ہے۔ محمود و ایاز سے متعلق میجر حسین شاہ قریشی کے طالب علمی کے دور کی تخلیق ہے۔ جس میں خواجہ خضر کا حوالہ بھی ہے۔ ''تین مزدور'' کے عنوان سے خود ایڈیٹر راقم الحروف کا لکھا ہوا ڈراما بھی شامل ہے۔ دو مزاحیہ مضمون بھی قابل توجہ ہیں۔ ایک تو ایم نصیر کا لکھا ہوا ''چچا بڈھن کی موت پر حوروں کا احتجاج'' ہے اور دوسرا خاکہ ''کالو'' کے عنوان سے صاحبزادہ عبدالحمید عباسی کے طالب علمی کے زمانے کی یادگار ہے اور خاصہ دلچسپ ہے۔ اور مجلّے کے اس شمارے میں پانچ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ کالو کی ''موت'' اس خاکہ کا نقطہ عروج ہے۔ اس کے غم ~~میں شاہ و گدا~~ سب شریک ہوتے ہیں۔ کالو کے مرثیے میں غالب کا ایک شعر بھی بہ ادنیٰ تصرف درج ہے۔ وہ شعر یوں ہے۔

ہاں اے فلک پیر، جوان تھا ابھی کالو　　　کیا تیرا اگبڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

اس مزاحیہ خاکے کے اختتام پر انکشاف ہوتا ہے کہ ''کالو'' کسی تیلی کے کولہو ''بیل'' تھا خود یہ انکشاف ایک دلچسپ انداز میں سامنے آتا ہے۔

میری ادارت میں مجلّہ نخلستان ادب کے دور جدید کا دوسرا شمارہ تین ماہ بعد جنوری ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ اس شمارے کے شروع میں عبدالقادر جوہر کے طالب علمی کے زمانے میں لکھا ہوا فارسی قصیدہ چھپا ہوا ہے۔ ان کے زور کلام کا نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

بیا درظل شہ گر تو زجور آسماں تری   درگراں جا ازستمہائے زبان جائے امان یابی

نشان دجلہ بغداد گر جوید نگاہ تو   بہاول پور بغداد است وستلج دجلہ ساں یابی

اس شمارے میں مرزا غالب کے اس وقت تک کے تین غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل ہیں ہیں جو عزیز نشتر غوری کے توسط سے حاصل ہوئے تھے۔ جبکہ وہ کالج کے طالب علم تھے۔ ان میں سے ایک خط کی تقریب یہ ہے کہ مرزا کے ایک دوست نے ان کی خدمت میں سہارنپور کے کچھ ''مالدہ'' آم بھیجے وہاں پہنچنے تک آم گل سڑ گئے۔ اس خط میں ان کی یوں مذمت کی:۔

''تم نہ آم بے دام بھیج کر مجھے بندہ بے دام بنانا چاہا، مگر

این خیال است و محال است و جنوں

وصولی کے لیے اسٹیشن پر گیا، چھ آنے کا خرچہ لازمی پڑا گیا۔ مگر انجام سے بے پرواہ، بظاہر جو تکلف برتا گیا تھا اس سے دل بلیوں اچھلنے لگا۔ مضبوط ٹکڑا اوپر تلے سلا ہوا تھا۔ بارے ٹوکری کھلی دلکش ابتداء کے ساتھ دل شکن انتہا! صرف اتنا معلوم ہوا کہ ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ سب افراد ایک ہی لمحہ میں باہر تھے۔

میاں! مجھے شیریں آم مرغوب ہیں۔ ذی روح چیزیں میرا کھاج نہیں۔ اس چھوٹی چھوٹی مخلوق کے وجود مسعود کا ان میں آ جانا نامعلوم کیا مصلحت رکھتا ہے۔ تم جانو! ابھی تک تو تمہا رتبہ مخلص دوست تک ہی محدود ہے۔ محسن بنو تو پھر بھیجو، کچھ شیریں اور نفیس!''

اسی شمارہ میں احمد ندیم قاسمی کا ایک افسانہ بھی شامل ہے۔ ''شاعر کی فتح'' کے عنوان سے، جو اُن دنوں رسالہ پیمانہ میں بھی چھپا تھا۔ سلطان محمود بلوچ (اب ریٹائرڈ میجر) کا مضمون ''مقاطعہ جوئی'' بھی شامل ہے جس میں کعب بن مالک سے معلق کا ۹ ہجری کا واقعہ دلچسپ انداز مین بیان کیا ہے۔ مشہور انگریز ناول نگار ٹرولوپ کی خود نوشت سوانح عمری کے کچھ حصے کا نہایت سلیس اُردو ترجمہ سید الیاس (فرسٹ ائیر) نے پیش کر رکھا

ہے۔ ان کے علاوہ نثر میں کئی ڈرامے افسانے اور مختصر مضامین بھی شامل ہیں۔ عبدالحمید تارتاری (بی اے فائنل) کے قلم سے ایک ہلکا پھلکا مضمون (انشائیہ) ''انسان کا دل'' بھی زینت صفحات ہے۔

ایڈیٹر راقم الحروف کی طرف سے مشہور انگریز شاعر فری مین کی مشہور نظم ''خوابیدہ سمندر'' کا آزاد منظوم ترجمہ بھی شائع ہوا جو یہ ہے:-

''خوابیدہ سمندر''۔ معصوم بچہ جیسے آرام سے سوتا ہے
اور راتوں کو بستر میں
آلام زمانہ سے بے خوف سا ہوتا ہے!
اور پانی کے چھینٹے
جب لہریں ابھرتی ہیں، چڑھتی ہیں، اترتی ہیں!
چھائی ہے خاموشی
ہر خواب سمندر پر
پر آب سمندر پر
معصوم بچے ایسا خاموش پڑا ہے
چپ چاپ تحیر میں دو چاند کھڑا ہے۔
آواز نہیں سنتے جو مردہ، لطیف اور ہلکی سی ہوا کے
جوں خوابیدہ بچہ چونکے، ڈر جائے، اٹھے شور مچائے
توں خوابیدہ سمندر بھی آہیں بھرنے گرائے، اٹھے شور مچائے
صبح و مسا میں نے
دیکھا یوں بسا میں نے

پروفیسر معین الدین حسن قریشی نے بڑی تفصیل کے ساتھ نخلستان ادب کا تجزیہ

کیا ہے اور تمام شماروں کے بارے میں جو دستیاب ہو سکے ہیں اپنی رائے دی ہے۔ ان کے بقول ''کلاسیکی ادب اور جدید ادب کے سلسلے میں جو خدمت نخلستان ادب سہ ماہی مجلّہ صادق ایجرٹن کالج بہاول پور نے سرانجام دی ہے وہ خطۂ پاکستان میں ناقابل فراموش ہے'' قیام پاکستان سے قبل کے شماروں کا جائزہ لینے کے بعد وہ رقم طراز ہیں ''نخلستان ادب'' کا تیسرا دور ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد شروع ہوتا ہے اس سال ملک میں جو سیاسی، سماجی اور ثقافتی بھونچال آیا قارئین کرام اس سے بخوبی واقف ہیں ریاستی، بہاول پوری یا سرائیکی زبان میں ہندی، ٹرینگی، پنجابی اور اُردو اس طرح باہم شیر وشکر ہوئے کہ:

''تو نہ تو، میں نہ میں بلکہ تو میں اور میں تو ہو گیا''

اس دور میں ہم لوگ جو اردو ادھار استعمال کر رہے تھے۔ اب اس کے اصلی وارث یہاں آ پہنچے۔ دلی، لکھنؤ، میرٹھ یعنی یوپی، سی پی، مشرقی پنجاب، کرنال، روہتک، حصار وغیرہ کی نقل آباد نے ریاستی زبان کی اجارہ داری کو توڑا۔ یعنی اس سرزمین کی روایات، محاورے اسلوب اور حکایات کو ایک نیا جنم دیا۔ اردو کی نئی چاٹ لگی۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے اردو ہماری قوم زبان بنی۔ اردو رکاری زبان بننے کے اعلان دفتری کاغذوں میں بھی ہوئے لیکن سرزمین بہاول پور میں قدرت نے سلسلہ فعل وانفعال ایسا شروع کیا کہ جیسے ہم نے فارسی مغلوں کے ڈر سے یا اثر سے سیکھی تھی۔ انگریزوں کی آمد پر رخصت ہوئی۔ لیکن انگریزی زبان بھی ہمارے بس کا روگ نہ تھا ہمیں نہ آنی تھی نہ آئی۔ اس لیے اردو یہاں موقع پا کر گھس آئی اور یہ مہاجر زبان ہماری ہی ہو کر رہ گئی۔ اگر چہ بابو لوگوں نے اسے سُرخ فیتوں میں بند کر رکھا ہے۔ لیکن ادارہ مجلس زبان دفتری کے ماہنامہ اردو نامہ نے تہیہ کر رکھا ہے کہ انہیں اردو سکھا کے چھوڑنا ہے۔

بہرحال صادق ایجرٹن کالج کی آبادی شمال کی بجائے جنوب ومشرق سے دو طرفہ بڑھی اور نخلستان ادب میں نئے خون کا اضافہ کیا۔ برصغیر کے مختلف اضلاع کے الفاظ،

لہجہ، محاورات وغیرہ کا اضافہ ہوا۔ اور اسی طرح ہمارے پہلے ادوار کے فارسی، عربی الفاظ محاورات کی بجائے جدید ادب کی تشکیل ہوئی۔

پروفیسر عبدالستار نیازی نے اپنے مقالے'' اُردو زبان و ادب میں'' نخلستان ادب'' کا کردار'' میں حوالوں کے ساتھ اس مجلے کے مختلف شماروں کے بارے میں لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں'' نخلستان ادب ۱۹۳۵ء کا شمارہ احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں شائع ہوا اس شمارے میں ان کا اپنا کلام، غزلیات نظمیں اور مضامین بھی شائع ہوئے اور احمد ندیم قاسمی دیباچے میں کالج کے شعراء اور ادباء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں'' اس وقت کالج میں ادباء اور شعراء کا جو اجتماع ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

نخلستان ادب کے ۱۹۳۷ء میں دو شمارے شائع ہوئے جن میں پہلا شمارہ اقبال نمبر ہے۔ اس میں اقبال کے فکر و فن پر مضامین اور نظمیں شائع ہوئیں گھمنڈ سنگھ طالب کا مضمون'' اقبال کا فلسفہ حیات'' بھی شائع ہوا وہ اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں:

> '' اقبال کی شاعری میں تغزل اور ترنم بھی ہے وہ شوکت الفاظ بھی رکھتی ہے اور چست بندش بھی۔ خیالات کی بلندی، اس میں داغ کی زبان، غالب کا فلسفہ، حالی و شبلی کی قومیت بھی اقبال کا وجود ملت کے وجود اجتماعی کے لیے سرتاپا عمل ہے''۔

الغرض نخلستان ادب قندیل رہبانی کی مانند نمودار ہوا۔ اور اس علاقے میں اُردو زبان و ادب کی اشاعت کے لیے ایسی شمعیں فروزاں کیں جنہوں نے آگے چل کر اردو زبان و ادب میں گراں قدر اور خوبصورت اضافے کیے۔ مستقبل کا کوئی مورخ بھی نخلستان ادب کی علمی و ادبی خدمات کو فراموش نہیں کر سکے گا۔

نخلستان ادب نے ریاست بہاول پور میں اُردو زبان و ادب کا نام کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ بقول شہاب دہلوی:

''نخلستان ادب کی بدولت بہاول پور کے نوجوانوں میں
شعروادب کا ذوق پروان چڑھا اوران میں لکھنے کی تحریک پیدا
ہوئی بہاول پور میں اُردوادب کی خدمات کا زمانہ اس رسالے
سے زیادہ کسی اوراخبار یارسالے کانہیں'' ☆

عزیزنشترغوری کے عربی کردہ غالب کے تین خطوط کا تذکرہ دلشاد کلانچوی کے حوالے سے پہلے آچکا ہے۔ محمد اختر فرحت نے اپنے مضمون ''اُردوادب کے فروغ میں بہاول پور کے تعلیمی اداروں کے رسائل وجرائد کا کردار میں اس مجلّے کے دیگر شماروں کا ذکر کرتے ہوئے اس شمارے کے بارے میں بھی لکھا ہے۔

جنوری ۱۹۳۹ء میں حافظ سید محمد صادق کی زیرنگرانی، دلشاد کلانچوی کی ادارت میں شائع ہونے والے شمارے میں عزیزنشترغوری مرزا غالب کے تین غیرمطبوعہ مکتوب چھپوائے۔ایک خط کی تحریر جس میں مرزاغالب کسی دوست سے مخاطب ہیں ملاحظہ ہو:

''میاں مجھے شیریں آم مرغوب ہیں ذی روح چیزیں
میراکھاج نہیں ۔اس چھوٹی چھوٹی مخلوق کے وجودمسعود کا ان
میں آجانا نہ معلوم کیا مصلحت رکھتا ہے۔تم جانوابھی تک تو تمہارا
رتبہ مخلص دوست تک ہی محدود ہے۔محسن بنوتو پھربھیجو کچھ شیریں
اورنفیس۔''

سنگیتا کنول نے بھی اپنے ایم اے اُردوواقبالیات کی سطح کے مقالے میں ان تمام شماروں کا تذکرہ کیا ہے کہ جواُسے میسر آسکے ہیں اورنخلستان ادب کی کاوشوں کواور بہاول پور میں اس کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہےاوراس بات پرافسوس کا اظہار کیا ہے کہ ۱۹۸۶ء کے بعد ۱۹۹۰ء تک کوئی مجلّہ شائع نہیں ہوا۔چونکہ یہ مقالہ ۱۹۹۰ء میں لکھا گیا

☆ تلاش بسیار کے بعد نہ تو یہ شمارہ مل سکا اور نہ ہی غالب کے خطوط۔اب یہ ماہرین غالب کا کام ہے کہ وہ ان خطوں کو غالب کے خطوط کے مجموعوں میں تلاش کریں (مرتب)

ہے اس لیے اس کا تذکرہ اسی سال تک ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۹۶ء تک نخلستان ادب کا کوئی شمارہ شائع نہیں ہوا۔ ان کی تفصیل گزشتہ صفحات میں موجود ہے۔

بہرحال اب تک نخلستان ادب کے جتنے نمبر بھی شائع ہوئے ہیں ان کی اپنی اہمیت اور افادیت ہے۔ ان میں سالگرہ نمبر، اقبال نمبر، تقسیم اسناد نمبر، فتح نمبر، بہار نمبر ۱۹۴۷ء، بہار نمبر ۱۹۵۴ء، صدیقی نمبر، پچاس سالہ نمبر، ساٹھ سالہ نمبر، قائد اعظم نمبر، اقبال نمبر، صد سالہ نمبر، انتخاب نخلستان ادب، گولڈن جوبلی نمبر اور ۲۰۰۶ء کا خواجہ فرید نمبر قابل ذکر ہیں۔ تاہم یہ سب شمارے کتب پر بھی مکمل طور پر دستیاب نہیں اس لیے محققین کے لیے خاصی دشواری پیش آتی ہے اور آتی رہے گی۔

(۴)

گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج بہاول پور سے میرا قدیمی اور قلبی تعلق ہے میرے والد مرحوم ملک خدا بخش محمود اور میرے عم بزرگوار ملک قادر بخش مرحوم نے اسی کالج سے بی اے کیا۔ میرے والد مرحوم والی بال کے مانے ہوئے کھلاڑی تھے اور انہیں ۴۱-۱۹۴۰ء میں رول آف آنر بھی ملا تھا علاوہ ازیں میرے محترم شاعر اور ادیب جناب احمد ندیم قاسمی بھی اسی کالج کے طالب علم رہے۔ احباب میں رفیق خاور جسکانی اور ڈاکٹر اسد فیض نے بھی اسی دارے میں تعلیم حاصل کی۔ میں نے جب ۲۷ ستمبر ۲۰۰۵ء کو فیصل آباد بورڈ کی چیئرمین شپ سے تین سال پورے کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں حاضری دی تو اس وقت اچھی جگہ خالی نہیں تھی۔ میری کوشش تھی کہ ملتان میں پوسٹنگ ہو جائے تاکہ میں اپنی ریٹائرمنٹ (۳۱ دسمبر ۲۰۰۷ء) تک اپنے گھر میں رہوں مگر رزق تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے جہاں لکھا ہے وہیں ملے گا۔ گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ لاہور میں اُردو کے پروفیسر کی اسامی خالی تھی میں نے چاہا کہ فی الوقت میری تقرری وہیں ہو جائے کہ اچانک سیکرٹری ایجوکیشن نے مجھے بلوا بھیجا اور گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج بہاول پور میں

بطور پرنسپل تعیناتی کی آفر دی جسے میں نے بخوشی قبول کر لیا اس لیے کہ بہاول پور ایک تو ملتان سے قریب تھا دوسرے میرا یونیورسٹی سے بھی کسی نہ کسی حوالے سے تعلق رہا تھا۔ چنانچہ میں نے ۲۸ نومبر ۲۰۰۵ء کو بہاول پور پہنچ کر چارج سنبھال لیا اور اب ایک سال کا عرصہ ہونے والا ہے کہ میں یہاں ہوں میں نے بہاول پور کے لیے کیا خدمات سرانجام دی ہیں اور کالج میں کیسی خوشگوار تبدیلیاں لایا ہوں اس کا فیصلہ تو میرے یہاں سے جانے کے بعد ہی ہوگا تاہم اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ میں حتی المقدور کوشش کی کہ اس کالج کی ساکھ بحال ہو جائے۔ اسی طرح میں نے نخلستان ادب کا ضخیم خواجہ فرید نمبر نکالا ہے جو فریدیات پر کام کرنے والوں کے لیے حوالہ کی چیز ہے اور اس کی ملکی سطح پر بڑی پذیرائی ہوئی ہے اس سے پہلے میں نے گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن ملتان کے پرنسپل کی حیثیت سے کالج کے مجلّے ''مسلک'' کے سرسید نمبر، غالب نمبر اور ملتان نمبر شائع کیے تھے خاص طور پر اس کا خواجہ فرید نمبر فریدیات کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں جو مضامین شامل تھے ان میں اور مقالات کا اضافہ کر کے عائدہ قریشی نے اسے مرتب کر کے تناظرات فرید کے نام سے سرائیکی ادبی بورڈ ملتان سے شائع کرایا تھا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کو جب نخلستان ادب کا خواجہ فرید نمبر ملا تو اُنہوں نے ٹیلی فون پر اس کی داد دی اور ساتھ ہی ساتھ یہ مشورہ دیا کہ اس نمبر کے مضامین کا ایک کڑا انتخاب کر کے اسے کتابی شکل میں شائع کیا جائے تو اس سے فریدیات پر کام کرنے والے فائدہ اٹھاسکیں گے۔

عام طور پر کالجوں کے مجلوں کو اہمیت نہیں دی جاتی تاہم بعض کالجز کے خصوصی نمبر ادب میں یادگاری حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اور اگر ان کے انتخاب کیے جائیں اور موضوع کے لحاظ سے مضامین کا مجموعہ مرتب کیا جائے تو اس سے استفادے کی صورت نکل سکتی ہے۔ نامور محقق اور استاد الاساتذہ ڈاکٹر وحید قریشی جب بزمِ اقبال لاہور کے سیکرٹری تھے تو اُنہوں نے اقبالیات کے حوالے سے کالجوں اور دیگر ادبی مجلوں کے اقبال

پر مضامین پر اقبال شناسی کے تناظر میں کتابیں مرتب کرائی تھیں اور انہیں شائع کیا تھا جو اقبالیات پر کام کرنے والوں کے لیے حوالے کا کام دے رہی ہیں میں نے بھی اسی سلسلے میں اقبال شناسی اور نخلستان، اقبال شناسی اور الحخیل اور اقبال شناسی اور نیرنگِ خیال مرتب کی تھیں دلشاد کلانچوی نے اقبال شناسی اور نخلستان ادب کے نام سے مضامین کا انتخاب تر ترتیب دیا تھا اور بزم اقبال نے اسے اقبال شناسی اور ایجرٹن کالج میگزین (نخلستان ادب کا نام دیکر شائع کیا تھا) یہ کتاب ۱۹۹۲ء میں منظرعام پر آئی۔ اس کے پیش لفظ میں دلشاد کلانچوی لکھتے ہیں:

> ''بہاول پور ایک کم آباد اور ریگستانی علاقہ ہے یہاں کھجور کے درخت عام ملتے ہیں جُھنڈ کے جھنڈ! یہ نخلستان اس علاقے میں عرب مسلمانوں کے آبسنے کی یادگار ہیں۔ انہی جغرافیائی، عمرانی اور ثقافتی کوائف کی نسبت سے اس کالج سے شائع ہونے والے اس علمی و ادبی جریدے کا نام بھی ''نخلستان ادب'' رکھا گیا اُس دور میں بہاول پور کے علاقے میں واقعی یہ کالج میگزین ایک علمی و ادبی نخلستان کی حیثیت ہی رکھتا تھا۔'' ☆

ابھی میں نے ایس ای کالج بہاول پور سے اپنے قلبی اور پھر انتظامی تعلق کا تذکرہ کیا ہے اور مجھے اس بات پر ناز بھی ہے کہ میں نے نخلستان ادب کا خواجہ فرید نمبر نکالا ہے اور یہ شمارہ تین سال کے وقفے کے بعد سامنے آیا ہے تاہم اس مجلے سے میرا تعلق ۱۹۷۳ء کا ہے کہ جب میں ۱۹۷۲ء میں کراچی کی ملازمت چھوڑ کر ملتان آیا تو ابھی تک ملازمتوں پر پابندی لگی ہوئی تھی اس لیے میں نے گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن ملتان میں بی ایڈ میں داخلہ لے لیا (یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ جب میری بیس گریڈ میں

☆ اقبال شناسی اور ایجرٹن کالج میگزین (نخلستان ادب) مرتبہ دلشاد کلانچوی بزمِ اقبال لاہور جون ۱۹۹۲ء۔ ص الف

ترقی ہوئی تو یکم اپریل ۱۹۹۶ء کو میں نے اس کالج کے پرنسپل کا عہدہ سنبھالا اور ۲۷ ستمبر ۲۰۰۲ء تک اسی عہدے پر فائز رہا) اور طالب علم شاعر کی حیثیت سے میں نے گورنمنٹ ایس ای کالج بہاول پور کی بین الکلیاتی تقاریب کے سلسلے میں منعقدہ مشاعرے میں شرکت کی اور غالباً دوسرا انعام حاصل کیا۔ میں نے صدائے بازگشت کے عنوان سے نظم پڑھی تھی جو ۱۹۷۳ء کے شمرے میں ص ۱۳۳-۱۳۲ پر شائع ہوئی ہے اس نظم کا میرے پاس کوئی ریارڈ بھی نہیں تھا اس لیے یہ میرے شعری مجموعے ''تو طے ہوا نا'' میں بھی شامل نہیں۔ سابقہ شماروں کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ نظم مجھے مل گئی جو یہاں پر درج کی جا رہی ہے۔

صدائے بازگشت

طاہر تونسوی

زندگی یوں وجولاں کہ روز وشب میں حسین اور پیار لمحوں کا بہروپ ہے
مگر زندگی
زندگی ہے تو پھر
زندگی تیری آواز کی دھوپ ہے
یوں بھی اکثر ہوا
ذہن کی تیرگی
درد کی بے کلی
تیری آواز کی دھوپ سے جیسے تھم سی گئی
یوں بھی اکثر ہوا
عرصۂ زیست کے جہد و پیکار میں
تلخ حالات سے
وقت کی بات سے

ذہن اک برف کی سل کی مانند جم سا گیا
لیکن اس تیرگی کے بیاباں میں بھی
تلخی سوز آلام پنہاں میں بھی
تیری آواز کی دھوپ بھی
ایک غمگین دل کا سہارا بنی
اور پھر دل کی اک نیم روشن پہاڑی سے
ٹکرا کے پلٹی ۔۔۔۔۔ مگر
ذہن کے ایک گوشے میں گم ہو گئی
اس طرح ۔۔۔۔
جیسے ابھرے گی پھر میرے ادراک سے
میرے تخیل و وجدان سے
اس صدا کی صدا
جو پکارے گی پھر سے مجھے
اور پوچھے گی وہ زندگی کا پتا
زندگی وہ کہ جو تلخی سوزِ ایام ہے
زندگی وہ کہ جو درد کا جور کا نام ہے
زندگی وہ کہ جولاں گہ روز و شب میں حسیں اور پیار لمحوں کا بہروپ ہے

اسی طرح ۱۹۸۶ء میں جب کالج کی صد سالہ تقریبات کا اہتمام کیا گیا تو میں نے خواجہ فرید سمپوزیم میں اپنا مقالہ پیش کیا اس تقریب کی صدارت وفاقی وزیر ریلوے سید یوسف رضا گیلانی نے کی تھی۔ پروفیسر عطاء اللہ اعوان نے جو رپورٹ لکھی تھی اس میں وہ لکھتے ہیں:

''بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی
نے ''خواجہ فرید کی اُردو شاعری کے فکری محاسن'' کے عنوان
سے ایک مقالہ پیش کیا ڈاکٹر صاحب نے دوسو سے زائد تحقیقی
مضامین لکھے ہیں۔ ''مسود حسن رضوی ادیب۔ حیات اور
کارنامے'' کے عنوان سے پی۔ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے۔
ملتان میں اُردو شاعری، شجر سایہ دار صحرا کا، حیاتِ اقبال،
اقبال اور پاکستانی ادب، اقبال اور سید سلیمان ندوی، اقبال
اور مشاہیر، اقبال اور شخصیات، خیر شاہ دا کلام اور ''چراغ
اعوان دی ہیر'' جیسی کتابوں کے مصنف ہیں۔'' ☆

گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج بہاول پور سے پہلے میرا قلبی اور پھر انتظامی تعلق پیدا ہوا پھر ادبی رشتہ قائم ہوا اور لمحۂ موجود میں اب اس سے تقریباً ایک سال کا عرصہ ہونے کی بنا پر جذباتی لگاؤ بھی ہے اور پھر یہ شہر خواجہ فرید کے مریدوں کا شہر بھی تو ہے اور اس میں شامل چشتیاں اور مہار شریف سے میرا تعلق مسلک چشتیہ کی وجہ سے بھی ہے کہ یہاں حضرت شاہ سلیمان تونسویؒ کے مرشد حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کا مزارِ مبارک بھی ہے۔ ان نسبتوں کی وجہ سے مجھے خیال آیا کہ کوئی نہ کوئی ایسا تحقیقی وتنقیدی کام کیا جائے جو اُردو ادب میں حوالے کا کام دے۔ چنانچہ اب تک جو کچھ میں نے کیا ہے یا کرنے جارہا ہوں اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

ملک کے معروف شاعر اور صحافی اور بہاول پور کے شعر و ادب کی پہچان مسعود حسن، شہاب دہلوی پر میری کتاب '' جہانِ تخلیق کا شہاب'' پریس میں ہے۔ سچل سرمست پر میری کتاب ''محبتوں کا پیامبر سچل'' چیئر شاہ عبدالطیف بھٹائی یونیورسٹی

☆ نخلستان ادب صد سالہ نمبر ۱۸۸۶۔۱۹۸۶ء

خیر پور نے حال ہی میں شائع کر دی ہے۔

گزشتہ بیس برسوں سے میں بونگا رمضان خاں کے صوفی شاعر قاضی محمد عارف کے منظوم سفر نامۂ حج پر کام کر رہا ہوں اور اب میں نے اسے ایڈٹ کیا ہے اور اس کا مقدمہ بھی تحریر کیا ہے یہ کتاب اُردو اکیڈمی بہاول پور شائع کرے گی اسی طرح میں نے اُردو اکیڈمی بہاول پور کے ادبی مجلّے الزبیر میں غالب پر شائع ہونے والے مضامین کیا ہے جو ''غالب شناسی اورالزبیر'' کے نام سے اُردو اکیڈمی بہاول پور کے اشاعتی پروگرام میں شامل ہے۔

''غالب شناسی اور نخلستان ادب'' میں میں نے اس مجلّے میں شائع ہونے والے مضامین کو ترتیب دیا ہے اور اس کا خیال مجھے عزیز نشتر غوری کے عطا کردہ غالب کے تین غیر مطبوعہ خطوط سے آیا جو نخلستان ادب کے جنوری ۱۹۳۹ء کے شمارے میں شائع ہوئے تھے۔ غالب پر مضامین کی تلاش میں میں نے نخلستان ادب کے تمام میسر شمارے دیکھے اور ان مضامین کو ترتیب دیا۔ بہت سے ایسے شمارے بھی ہیں جن میں غالب پر مضمون شائع ہوا ہے مگر وہ دستیاب نہیں ہو سکے اسی طرح غالب کے خطوط والا شمارہ بھی کوشش کے باوجود نہیں مل سکا۔ مضامین کی ترتیب اس طرح سے ہے۔

نمکدان اور غالب کے زخم	اختر الٰہی	۱۹۳۱ء
جنسِ غالب بدست غیر	دلشاد کلانچوی	۱۹۳۱ء
مرزا غالب	سردار احمد سعید	جنوری ۱۹۳۸ء
مرزا غالب	ایم اے عزیز نشتر	ستمبر ۱۹۳۸ء
معاصرین پر غالب کا اثر	نسیم علوی	جنوری ۱۹۳۹ء (اسی شمارے میں غالب کے خطوط شائع ہوئے
غالب اور ان کی نثر	رشید احمد صدیقی	۱۹۵۴ء (بہار نمبر)
غالب اور ان کی پُر لطف شاعری	محمد جمیل اختر	۱۹۵۴ (بہار نمبر)

غالب اور اس کی ادبی خدمات	دلشاد کلانچوی	اکتوبر ۱۹۵۵ء
اُردو شاعری کا رجحان (ولی تا غالب)	کنور مہر الٰہی	مئی ۱۹۵۷ء
غالب کی اصلاحی شاعری	سید محمد اختر سعید	مئی ۱۹۵۷ء
غالب کی اُردو نثر	محمد عبید اللہ	مارچ ۱۹۶۰ء (صدیقی نمبر)
غالب کی شخصیت و عظمت	دلشاد کلانچوی	۱۹۶۲ء (پچاس سالہ نمبر)
غالب کی شخصیت و فن	اسد اریب	۱۹۶۲ء (پچاس سالہ نمبر)
غالب کا ایک شعر	فیض حسن	۱۹۶۲ء (پچاس سالہ نمبر)
غالب کا تصورِ عشق	جمیل احمد خاں	۱۹۶۷ء
غالب اور غزل	مسعود گیلانی	۱۹۶۸ء
غالب کا فارسی کلام	محمد سلطان	۸۵-۱۹۸۴ء (بہار نمبر)
خطوطِ غالب ادب کا سرمایہ	محمد اشرف	۱۹۸۶ء (صد سالہ نمبر)
کلامِ غالب کی تضمینیں	سید محمد ادریس عزم نجمی	۱۹۸۶ء (انتخاب)
یومِ غالب کیوں؟	محمد سلمان سید	۱۹۹۷ء (پاکستان گولڈن جوبلی نمبر)

ان مضامین میں سے جو دستیاب نہیں ہو سکے وہ یہ ہیں۔

نمکدان اور غالب کے زخم	اختر الٰہی
جنسِ غالب بدستِ غیر	دلشاد کلانچوی
مرزا غالب	ایم۔ اے عزیز نشتر
معاصرین پر غالب کا اثر	نسیم علوی
مرزا غالب کے تین غیر مطبوعہ خط	عطیہ، عزیز نشتر غوری
غالب کی شخصیت و عظمت	دلشاد کلانچوی
غالب کا ایک شعر	فیض حسن

جو مضامین مل سکے ہیں اُنہیں نئی ترتیب کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ ان مضامین کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ غالب کے بارے میں تحریر کیے گئے ہیں جو ہر حوالے سے ادب پر غالب ہے اور غالب رہے گا۔ ان کے عنوانات پر نظر ڈالیں تو غالب فہمی کا ایک نیا جہان آیا نظر آتا ہے اور پھر یہ بھی مضامین سوائے رشید احمد صدیقی کے غالب شناسوں کی نظروں سے اوجھل رہے ہیں کہ ان کا حوالہ کہیں پر بھی نہیں ملتا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ یہ کالج کے طلبہ کے تحریر کردہ ہیں اور کچھ کالج کے اساتذہ کے ہیں۔ اس عہد کے طالب علم ادب کے بھی رمز شناس تھے اور غالب کے بھی اس لیے ان سب کے لکھنے والوں نے مختلف زاویوں سے غالب کی شاعری، اس کی نثر، اس کی فارسی اور اس کی اصلاحی شاعری کے ساتھ ساتھ کلامِ غالب کی تظمینوں پر قلم اٹھایا گیا ہے۔

ان تیرہ مضامین میں غالب ایک نئے رخ کے ساتھ سامنے آیا ہے اور ان مضامین کا عرصۂ تحریر ۷۵ برسوں پر محیط ہے جو ان کی اہمیت اور افادیت کی نشاندہی کرتا ہے آخری مضمون یومِ غالب کیوں؟ ایک ایسا استفسار یہ ہے جو اپنے اندر ایک الگ معنویت رکھتا ہے اور غالب کی عظمت کی عکاسی بھی کرتا ہے۔

اس پس منظر میں غالب پر لکھے گئے مضامین کی اہمیت اور افادیت اپنی جگہ موجود ہے اس لیے کہ غالبیات کے سلسلے میں کام کرنے والوں کے لیے یہ مقالات نئے ہیں اور پھر یکجا ہو گئے ہیں جس کی بدولت وہ ان کی تلاش وجستجو سے بچ گئے ہیں۔ میرے نزدیک یہی اس کتاب کے ترتیب دینے کا جواز بھی ہے کہ یہ کام کتابی شکل میں سامنے آ رہا ہے اور اب اس کی حیثیت مستقل ہو گئی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ میری اس کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے کہ میں نے غالب شناسوں اور غالبیات پر کام کرنے والوں کے لیے سہولت پیدا کر دی ہے اور نخلستان ادب سے اپنا ایک توانا تعلق بھی اُستوار کیا ہے۔

(۶)

میں نے اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر نجیب جمال صاحب پروفیسر وڈین اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے لکھوایا ہے اس لیے کہ اُنہوں نے یگانہ نگیزی پر پی ایچ ڈی کی ہے اور یگانہ و غالب کے بارے میں ان کی ایک کتاب بھی منظرِ عام پر آ چکی ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ محقق اور نقاد بھی ہے اور جدید و قدیم ادب دونوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ غالب شناسی میں بھی اُنہیں درک حاصل ہے علاوہ ازیں وہ میرے رفیق کار بھی رہے ہیں اور میرے احباب میں بھی شامل ہیں اور ان سے ایک تعلق خاطر بھی ہے۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ اُنہوں نے میری اس کوشش کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔

(۷)

میں نے اس کتاب کا انتخاب اُردو کے نامور شاعر، کہانی کار کالم نگار تنقید نگار اور اُردو ادب میں شرافت و انسانیت کے علمبردار جناب احمد ندیم قاسمی کے نام کیا ہے جو گورنمنٹ صادق ایجرٹن بہاول پور کے طالب علم بھی رہے ہیں اور نخلستان ادب کے مدیر بھی رہے ہیں اور بہار ۱۹۳۵ء کا شمارہ ان کی ادارت میں نکالا تھا۔ اگرچہ یہ شمارہ مجھے دستیاب نہیں ہو سکا تاہم اس کا حوالہ نخلستان ادب پر تبصروں میں موجود ہے۔ انہوں نے اپنے تمام رسائل کا ذخیرہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کی لائبریری کو بطور عطیہ دیا دیا تھا میرا خیال تھا کہ یہ شمارہ وہیں سے مل جائے گا اور میں نے اس سلسلے میں چیف لائبریرین عبدالوحید صاحب سے رابطہ کیا تھا اُن کا ۱۹ اگست ۲۰۰۶ء کا لکھا ہوا خط مجھے ملا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

''آپ کا مطلوبہ شمارہ قاسمی صاحب کے وصول شدہ رسائل میں شامل نہیں ہے''

بہر حال تلاش جاری رکھنا چاہیے تا کہ اُردو ادب اور خاص طور پر احمد ندیم قاسمی پر کام کرنے والوں کے کام آ سکے۔

ندیم صاحب اب ہم میں نہیں مگر ان کا نام اور کام زندہ ہے اس لیے وہ تا ابد زندہ رہیں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین۔ ان سے میری نیازمندی وقت کی قید سے آزاد ہے اور یہی میرا اندرانہ نیازمندی ہے۔

طاہر تونسوی
پرنسپل
گورنمنٹ ایس ای کالج بہاول پور
۱۵ اکتوبر ۲۰۰۶ء
۲۱ رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ

العائشہ۔ غالب سٹریٹ
غفاریہ کالونی بوسن روڈ
ملتان

دیباچہ

''غالب شناسی اورنخلستان ادب'' ڈاکٹر طاہر تونسوی کے اسلوب کار'' کا تازہ ترین کارنمایاں ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کے تحقیق و تدوینی کام کے سلسلے میں ''اسلوب کار'' کی ترکیب بجا طور پر مرحوم و مغفور ڈاکٹر سید معین الرحمان کی وضع کردہ ہے۔ یہ ترکیب کس قدر بامعنی ہے اس کا اندازہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تالیف کردہ کتب کی طویل فہرست دیکھ کر ہی کیا جاسکتا ہے۔

اس فہرست میں شامل ترتیب و تدوین کے باب میں بعض نامور ادبی شخصیات کے بارے میں کتب کو جس قدر قرینے اور سائنٹفک انداز میں تالیف کیا گیا ہے مجھے اس حوالے سے کوئی دوسری شخصیت ان کے قریب قریب دکھائی نہیں دیتی۔ ان کے کام کرنے کا اسلوب بے ساختہ، بے باکانہ اور ہنگامہ پرور ہے ان کے تصنیفی و تالیفی ارادے کسی سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تابع نہیں ہوتے وہ جس ادارے یا شہر میں ہوتے ہیں ان کے ارادے اس مختصر سے قیام میں تیزی کے ساتھ روبہ عمل ہوتے ہیں اور ان کے نتائج ایک آدھ نہیں بلکہ کئی کتابوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر صادق ایجرٹن کالج میں بہ حیثیت پرنسپل ان کے قیام کے حالیہ دنوں میں کالج کے مجلے ''نخلستان ادب'' کا ضخیم خواجہ فرید نمبر نہایت خوب صورت اور جاذب نظر صورت میں ان کی زیر سرپرستی شائع ہو چکا ہے مجھے یقین ہے کہ کالج میں پہلے دن قدم رکھتے ہی جو پہلا خیال ان کے ذہن میں برق کے کوندے کی طرح لپکا ہوگا وہ ضرور نخلستان ادب کا خواجہ فرید نمبر نکالنے کا ہوگا۔ اسی سلسلے کی دوسری کڑی اس وقت کتابی صورت میں آپ کے ہاتھ میں ہے اور ایک تیسری کتاب ''غالب شناسی اور الذبیر'' ان دنوں زیر ترتیب ہے اور اسی طرح خواجہ فرید

پر لکھی جانے والی کتب اور مضامین کا اشاریہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے شعبہ سرائیکی کے اشاعتی پروگرام میں شامل ہے اور نہ جانے کتنے منصوبے نمود پذیر ہونے کے لیے بے چین ہوں گے۔ تاہم کسی نئی ذمہ اری کا بلاوا نہ آ گیا۔ جن لوگوں نے نخلستان ادب (The Oasis)) کا خواجہ فرید نمبر دیکھا ہے یہ ممکن نہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر طاہر تونسوی کے ذہن رسا اور تحرک عمل کی داد نہ دی ہو۔ وہ اس سے پہلے گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن ملتان کے پرنسپل کی حیثیت سے بھی کالج کے مجلے ''مسلک'' کا خواجہ فرید نمبر شائع کر چکے ہیں ان دونوں مجلوں کے یہ نمبر اب فریدیات پر کام کرنے والوں کے لیے حوالے کی دستاویز بن چکے ہیں۔ ''مسلک'' کے سرسید نمبر، غالب نمبر، قائداعظم نمبر اور ملتان نمبر نے بھی علمی وادبی حلقوں میں گونج پیدا کی خصوصاً سرسید نمبر میں شامل سرسید پر لکھی گئی کتب اور مضامین کا اشاریہ الگ سے کتابی صورت میں پاکستان اور بھارت سے شائع ہو چکا ہے۔

اب صورت یہ ہے کہ ''غالب شناسی اور نخلستان ادب'' کسی ایک کتاب کا عنوان نہیں ہے بلکہ یہ دراصل اپنے اندر دو مکمل کتابوں کا متن سمیٹے ہوئے ہے۔ میری مراد کتاب کے مقدمے اور مضامین کے انتخاب سے ہے۔ کتاب کا مقدمہ اس قدر مفصل اور جامع ہے کہ یہ اپنے طور پر ایک مکمل کتاب کا درجہ رکھتا ہے اور اردو میں لکھے گئے بعض ایسے طویل اور یادگار مقدموں کی یاد دلاتا ہے جو کچھ مدت بعد کتاب کے اصل متن سے جدا ہو کر کتابی صورت میں شائع ہوئے اور ان کی علیحدہ پہچان قائم ہوئی۔ ''غالب شناسی اور نخلستان ادب'' کا مقدمہ بھی مستقبل میں ایک الگ کتاب کی شکل میں شائع ہونے کے قوی امکانات رکھتا ہے۔ یہ مقدمہ دراصل گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج بہاول پور اور اس کے مجلے ''نخلستان ادب'' (The Oasis) کے بارے میں ایک تحقیقی دستاویز ہے۔ کالج کا قیام اس کے موسس کی تعلیم سے دلچسپی، کالج کے ابتدائی سالوں میں معیار تعلیم، اساتذہ کی

ترجیحات، کالج کی سو سالہ تقریبات کے سلسلے میں شائع ہونے والے مضامین و مقالات کے اقتباسات کی صورت ریاست بہاول پور میں تعلیم پر توجہ اور تعلیمی اداروں کے قیام موسسین کی خدمات کا تاریخی جائزہ ابتدائی طور پر قائم ہونے والے اور نیٹل سکول بہاول پور اور بعد ازاں ایجرٹن اپر سکول میں پڑھائے جانے والے مضامین، اساتذہ اور طلباء کی تعداد اور سکول کی عمارتوں کی تفصیل، ۱۸۸۵ء میں سائنسی علوم کی تجربہ گاہ کے ساتھ اینگلو ورنا کیولر صادق مڈل اسکول اور پھر ۱۸۸۶ء میں ''صادق ایجرٹن کالج'' کے قیام کا سنگِ میل اور ۲۲ ستمبر ۱۸۸۶ء کو کالج کے پہلے پرنسپل بابو پرسن کمار بوس کی تقرری اور کالج کا گورنمنٹ کالج لاہور اور اور ایف سی کالج لاہور کے معاصر ہونے کا اعزاز، ۱۹۹۲ء میں ڈگری کلاسوں کا اجراء، ابتدائی طور پر کالج کی مختلف عمارات اور ۱۹۰۷ء میں کرنل ڈیس کے ہاتھوں صادق ڈین ہائی سکول جس میں کالج منتقل ہوا کا سنگِ بنیاد، ہوسٹل کی تعمیر اور ۱۹۵۰ء میں کرنل اے جے ڈرنگ کے ہاتھوں موجودہ عمارت کا قیام، شعبہ جات کی تفصیل، کالج کے سالانہ کانووکیشن کی تقاریب اور ان میں بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کرنے والی برصغیر پاک و ہند کی معروف علمی ادبی شخصیات کے اسمائے گرامی، اور اس سلسلے کا اہم ترین کارنامہ نخلستان ادب کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۲۳ء میں شائع ہونا۔ یہ سب تفصیلات یکے بعد دیگر تجسس انگیز طور پر سامنے آتی ہیں۔ اس سلسلے کی آخری کڑی نخلستان ادب کے پہلے شمارے کے سال اشاعت کا تعین ہے۔ اور یہی وہ مرحلہ ہے جہاں ڈاکٹر طاہر تونسوی کے اندر کا محقق اچانک انگڑائی لے کر بیدار ہوتا ہے اور مانگے کی روشنی کے بجائے اپنے حصے کا چراغ اپنے ہاتھوں سے روشن کرتا ہے۔

''نخلستان ادب'' کی تاریخ اشاعت کا تعین ایک متنازعہ مسئلہ چلا آ رہا ہے کچھ لوگوں کے خیال میں یہ مجلّہ ۱۹۱۲ء سے نکلنا شروع ہوا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی مجبوری یہ تھی کہ انہیں نہ صرف صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کے مجلے کی تاریخ اشاعت کا تعین کرنا تھا

بلکہ پنجاب کے دو بڑے کالجوں گورنمنٹ کالج لاہور اور اسلامیہ کالج کے قدیمی اور تاریخی مجلات راوی اور کریسنٹ کی اشاعت کے اولین سالوں کے سلسلے میں پائے جانے والے ابہام کو بھی دور کرتا تھا۔ تاکہ ان تینوں مجلات کی اہمیت کے علاوہ ان کی تقدیم وتاخیر کے مسئلے کو بھی حل کیا جا سکے۔ اور یہی اس مقدمے کا سب سے طاقت ور حصہ ہے، جس کی تفصیل بجائے خود نہ صرف دلچسپ ہے اور معلومات افزاء ہے بلکہ تحقیق کے اصولوں کے عین مطابق بھی ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تحقیق کے مطابق مذکورہ کالجوں کے مجلات کے حوالے سے اسلامیہ کالج لاہور کو اولیت حاصل ہے، جس کے مجلّے ''کریسنٹ'' کا پہلا شمارہ ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا دوسرے نمبر پر گورنمنٹ کالج لاہور کا مجلّہ ''راوی'' شائع ہونا شروع ہوا اور اس کا پہلا شمارہ ۱۹۱۰ء میں نکلا اور تیسرے نمبر پر ''صادق ایجرٹن کالج بہاول پور'' کا مجلّہ ''نخلستان ادب'' ۱۹۲۳ء سے شائع ہونا شروع ہوا اگرچہ اس مجلّے کے بارے میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا پہلا شمارہ ۱۹۱۲ء میں طبع ہوا تھا۔ چونکہ ان لوگوں میں شہاب دہلوی، عبدالحمید ارشد، دلشاد کلانچوی اور معین الدین قریشی کے بیانات شامل ہیں اور پھر ''نخلستان ادب'' کے ۱۹۷۲ء، ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۶ء کے سرورق پر جاری شدہ ۱۹۱۲ء تحریر ہے۔ اور اسی نسبت سے مجلّے کا پچاس سالہ اور ساٹھ سالہ نمبر نکالا گیا اس لیے ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اس خیال کو بھی رد نہیں کیا ہے اور حرف آخر لکھنے سے گریز کیا ہے کیوں کہ ان کے خیال میں اس پر تحقیق جاری رہنی چاہیے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنے مقدمے میں رسالہ ''نخلستان ادب'' علمی و ادبی معیار پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور ایسے تمام ادباء اور شعراء کی تخلیقی سرگرمیوں کو بطور خاص موضوعات بنایا ہے جن کی اس رسالے کے ذریعے سے نہ صرف تربیت ہوئی بلکہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بھی ملی۔ خصوصاً طالب علمی کے زمانے میں جناب احمد ندیم قاسمی اور جناب محمد خالد اختر نہ صرف یہ کہ مجلّے کے مدیر رہے ہیں بلکہ ان کی ابتدائی نگارشات

بھی ''نخلستان ادب'' میں شائع ہوئیں نخلستان ادب ۱۹۳۵ء کا شمارہ احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ ان کے علاوہ لکھنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے جسے مقدمے کے صفحات میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

''نخلستان ادب'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک ادبی مجلّہ ہے۔ دنیا بھر میں تعلیمی ادارے اپنے طالب علموں کی علمی و ادبی تربیت کے لیے اپنے رسائل شائع کرتے ہیں جن میں اگرچہ اساتذہ اور نامور ادیبوں کی نگارشات بھی شامل ہوتی ہیں تاہم طالب علموں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور ان میں ادب کا ذوق و شوق پیدا کرنے کے لیے خاص طور پر مجلّے کے صفحات مخصوص کیے جاتے ہیں۔ یہ تمہید میں نے اس لیے باندھی ہے تا کہ یہ باور کرایا جائے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق مختلف ممالک یا ان کے تعلیمی اداروں کی ترجیحات کے باوجود ادب، آرٹ اور کلچر کی نمود ہر معاشرے کے لیے از بس ضروری ہے تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جن تہذیبوں سے ادب یا آرٹ یا کلچر منہا ہو گئے وہ تہذیبیں مٹ گئیں۔ آرٹ اور کلچر دراصل انسانی احساسات، تخیلات، تصورات اور تجربات کے ترجمان ہوتے ہیں اس لیے ہر معاشرے کو ان کی ضرورت ہے اور موجودہ دور میں جب علوم کی تعلیم و تدریس مارکیٹ اکانومی کے تابع ہو چکی ہے۔ مشینوں کی حکومت نے احساس مروت کو کچل ڈالا ہے، انسان روبوٹ کی طرح اپنے خیالات سے بھی بے گانہ ہو گئے ہیں، سوسائٹی میں عدم توازن کی کیفیت ہے ایسے میں اس بگڑتے ہوئے توازن کو ادب، آرٹ اور کلچر جیسی اقدار و روایات کو بڑھاوا دے کر ہی تو متوازن بنایا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے بڑی طمانیت محسوس ہو رہی ہے کہ ''نخلستان ادب'' اس حوالے سے اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کر رہا ہے خصوصاً حالیہ سال میں اس کے خواجہ فرید نمبر کی اشاعت اور اب ''نخلستان ادب اور غالب شناسی'' کی طباعت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر طاہر تونسوی کی خصوصی حیثیت اور حسن عمل کا نتیجہ ہے۔

اقبال شناسی کی طرح غالب شناسی کی روایت بھی اب بین الاقوامی دستور عمل (International Phenomenon)) بن چکی ہے اقبال بیسویں صدی کا تو غالب انیسویں صدی کا اُردو کا بلا شبہ سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس سلسلے کی تیسری کڑی اٹھارہویں صدی کے نمائندہ شاعر میر تقی میر کی شاعری ہے۔

غالب کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ جہاں کلاسیکی روایات کی امین ہے وہاں جدید طرز احساس کی حامل بھی ہے اس لیے ادب سے دلچسپی رکھنے والا کوئی عام سے عام قاری یا ادب کے معیارات کو جانچنے اور طے کرنے والا کوئی بڑے سے بڑا نقاد خواہ اس کی دلچسپی کلاسیک سے ہو یا جدیدیت سے غالب کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتا۔ بقول اقبال

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا

یہی وجہ ہے کہ غالب شناسی کو اب ایک مستقل موضوع کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ یہی نہیں بلکہ برصغیر میں غالب کے حوالے سے اکیڈمیاں ادارے اور لائبریریاں قائم ہو چکی ہیں۔ غالب کی شاعری کی تفہیم کے حوالے سے لکھی جانے والی شرحوں کی تعداد سو کے لگ بھگ ہے اور یہ تعداد اب بھی ایک ورلڈ ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ غالب کے شارحین میں حالی، حسرت موہانی، نظم طباطبائی، نیاز فتح پوری، جوش ملسیانی، عبدالباری آسی اور مولانا غلام رسول مہر جیسی شخصیات شامل ہیں اور یہ سلسلہ ابھی نامختتم ہے اس کے علاوہ غالب کے فکر وفن کے حوالے سے لکھی گئی کتب کی تعداد اب سینکڑوں سے تجاوز کر چکی ہے۔ غالب کو یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ ان کی صد سالہ برسی کی تقریبات اور دوصد سالہ پیدائش کی تقریبات ساری دنیا کے اردو حلقوں میں منعقد کی گئیں اور بے شمار کتب رسائل کے خصوصی نمبر اور بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوئے ان سب کاوشوں سے سوا غالب پر لکھے گئے ہزاروں مضامین رسائل وجرائد کی فائلوں میں گم پڑے ہوئے ہیں اگر چہ ان رسائل

کے حوالے سے بھی غالب شناسی پر مبنی مضامین کو شائع کرنے کا اختصاص ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر طاہر تونسوی سے ہی سے حاصل ہے اور یہ سلسلہ بھی ابھی جاری ہے جیسا کہ میں نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے کہ ''نخلستان ادب اور غالب شناسی'' کے بعد ''الذبیر اور غالب شناسی'' طباعت کے لیے تیار ہے۔

''نخلستان ادب اور غالب شناسی'' نخلستان ادب میں شائع ہونے والے ان مضامین کا انتخاب ہے جو غالب کی شخصیت، فکروفن، ادبی خدمات، فارسی شاعری اور اسلوب نثر کے بارے میں لکھے گئے۔ اگرچہ بعض اہم مضامین جن کی تفصیل مقدمہ میں دی گئی ہے عدم دستیابی کے باعث شامل ہونے سے رہ گئے تاہم موجودہ انتخاب موضوعاتی اعتبار سے خاصا متنوع ہے۔ کتاب میں شامل مضمون نگاروں میں پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے مستند اور معروف غالب شناس کا مضمون ''غالب کی نثر'' کے حوالے سے نہایت درجہ اہم ہے ان کے علاوہ دیگر مضامین کے مصنفین میں سے ڈاکٹر اسد اریب اور دلشاد کلانچوی بھی آج برصغیر کے نامور دانش وروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس مجموعہ مضامین کی ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ غالب کے حوالے سے کم وبیش تمام اہم موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنے مقدمے میں بھی اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''ان کے عنوانات پر نظر ڈالیں تو غالب فہمی کا ایک نیا جہان آباد نظر آتا ہے ان تیرہ مضامین میں غالب ایک نئے رخ کے ساتھ سامنے آتا ہے اور ان مضامین کا عرصہ تحریر ۷۵ برسوں پر محیط ہے جو ان کی اہمیت اور افادیت کی نشان دہی کرتا ہے''۔

کتاب کا آخری مضمون ''یوم غالب کیوں؟'' نہ صرف اپنے عنوان بلکہ اپنے استدلال کے اعتبار سے بھی منفرد ہے ڈاکٹر طاہر تونسوی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ ''ایک ایسا استفسار یہ ہے جو اپنے اندر ایک الگ معنویت رکھتا ہے اور غالب کی عظمت کی عکاسی بھی کرتا ہے''۔

یہ سب مضامین کچھ تو کالج کے طلبہ نے لکھے ہیں اور کچھ اساتذہ نے قلم بند کیے ہیں تاہم طلبہ کے لکھے گئے مضامین میں بھی ان کی غالب فہمی اور ادبی رچاؤ نمایاں ہے۔ اسی لیے یہ کتاب غالب فہمی کے سلسلے کی ایک اہم کڑی قرار پائے گی اور اس کے مضامین کی تلاش وترتیب پر ڈاکٹر طاہر تونسوی کو مبارک باد دینی چاہیے۔

۱۸ اکتوبر ۲۰۰۶ء

ڈاکٹر نجیب جمال
ڈین فیکلٹی آف آرٹس
دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور

پروفیسر رشید احمد صدیقی

غالب اور ان کی نثر

ہر شخص غالب سے بحیثیت ایک شاعر کے واقف ہے۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ ایک بڑے نثر نگار بھی تھے اور ان کی نثر میں لطافت و ظرافت کا وہی عنصر شامل ہے جو ان کی شاعری میں ہے۔

غالب کی نثر کا میدان زیادہ تر ان خطوط تک محدود ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے دوستوں کو لکھے تھے۔ یہ خطوط نہ صرف نثر کا نادر نمونہ ہیں بلکہ ان خطوط کو پڑھنے کے بعد انسان ان کی شخصیت اور شاعری کے متعلق بھی رائے قائم کرسکتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے خطوط میں بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل کو خود ہی سلجھادیا ہے جو ان کی شاعری میں پیدا ہو گئے تھے۔ مثلاً ان کے استاد عبدالصمد کا مسئلہ۔ یا ان کے مذہبی عقائد یا ان کا صوفیانہ مسلک وغیرہ۔ ان مسائل کو ہم ان کے خطوط پڑھنے کے بعد خوب سمجھ سکتے ہیں۔

غالب کے ناقدین کا ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو غالب کے خطوط کو اُردو نثر کا کوئی اہم کارنامہ نہیں سمجھتا۔ درحقیقت غالب اُردو کے پہلے اور غالباً آخری اپنی طرز کے مکتوب نگار تھے۔ اگرچہ بعد میں ان کے چند شاگردوں نے ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی مگر بری طرح ناکام رہے۔

غالبؔ کا خط نویسی کا کمال اس حد تک بلند ہے کہ ہم اگر کہیں کہ وہ نثر نگاری کے تمام شعبوں پر حاوی ہے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کے خطوط میں وہ تمام چیزیں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں جو نثر نگاری کے لیے ضروری ہیں۔ سلاست زبان۔ واقع نگاری۔ طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت۔ یہ تمام عناصر ہمیں ان کے خطوط میں یکساں ملتے ہیں۔ پھر کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کہ ہم انہیں اُردو کے بہترین نثر نگاروں کی صف میں شامل نہ کرلیں۔

غالب کے شائع شدہ خطوط کو ہم حسب ذیل چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

- وہ خطوط جو ۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۶ء تک لکھے گئے۔
- وہ خطوط جو ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں لکھے گئے۔
- وہ خطوط جو ۱۸۵۹ء تا ۱۸۶۳ء لکھے گئے۔
- وہ خطوط جو ۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۹ء لکھے گئے۔

غالب کے خطوط میں عام طور پر ہمیں دستخط و تاریخ ملتی ہے۔ مگر چند خطوط ایسے بھی ہیں۔ جن کی تاریخ کا کوئی صحیح علم نہیں ہے۔ لیکن کیونکہ بدقسمتی سے ایسے خطوط جن پر دستخط و تاریخ نہیں ہوتی۔ زیادہ اہم اور ان کے حالات زندگی پر زیادہ روشنی ڈالتے ہیں اس لیے ہمیں مجبوراً انہیں بھی پڑھنا پڑتا ہے۔

خطوط نویسی کا پہلا دور:

یعنی ۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۶ء تک یہ دور پانچ سالوں پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ دور غالب کی زندگی میں چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ اس پانچ سالہ دور میں ان کی زندگی میں صرف ایک اہم واقعہ رونما ہوا اور محض اسی چیز پر ہمیں اس دور کے خطوط ملتے ہیں یعنی اس دور میں وہ بہادر شاہ ظفر کے یہاں شاہی مورخ و شاعر مقرر ہوئے تھے۔ اسی دور میں انہوں نے اپنی تصنیف ''مہر نیمروز'' لکھی۔ غالباً کسی خط میں خلعت ملنے پر بھی اظہار خوشی کیا گیا ہے۔

دوسرا دور:

اس سے اگلا دور یعنی ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء ان کی زندگی کا اہم ترین دور ہے۔ زندگی کا یہ دور اُن کے لے مصائب و مشکلات ساتھ لایا۔ کیونکہ غدر ہند کے اثرات کا شکار ہونے سے یہ بھی نہ بچ سکے اور اسی سلسلہ میں ان کا خلعت وغیرہ بھی چھن گیا۔ اس کے علاوہ یہ دور چند اور نئی مشکلات بھی اپنے ساتھ لایا۔ اس دور کے خطوط میں حد درجہ

یاس وقنوطیت برتی ہے اور ظرافت کا عنصر بھی (کسی حد تک) مفقود ہے۔

لیکن یکا یک اس کے بعد مسرت وشادمانی کا دور آتا ہے ان کا خلعت اور پنشن واپس مل جاتی ہے۔ ان کا دیوان بھی اسی دور میں چھپتا ہے۔ وہ اس چیز کا ذکر اپنے خطوط میں نہایت فخر کے ساتھ کرتے ہیں۔

اس کے بعد ہمیں غالب کے وہ خطوط ملتے ہیں جن پر تاریخ درج نہیں ہے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ ایسے بلا تاریخ کے خطوط ہی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''کیوں صاحب! ہم سے خفا ہوئے کہ ملنا بھی چھوڑا۔ خیر میری تقصیر معاف کرو۔ اور اگر ایسا ہی گناہ عظیم ہے کہ کبھی نہ بخشا جائے گا تو وہ گناہ مجھ پر ظاہر کر دو......... ورنہ اس کا نقش صفحہ دھر سے مٹ جائے گا۔ والسلام؟ عنایت کا طالب غالب۔''

اب غالب کی زبانی ان کے پیر و مرشد عبد الصمد کا قصہ سنئے۔ فرماتے ہیں۔

مجھکو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبد الصمد ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ مجھ کو لوگ بے استاد کہتے تھے۔ ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا۔ اور سنئے اس کے بعد فرماتے ہیں۔

''آرائش مضامین کے واسطے کچھ تصوف، کچھ نجوم لگا رکھا ہے۔ ورنہ سوائے موزونئ طبع کے یہاں کیا رکھا ہے۔''

اوپر کے خطوط کے تین نمونے پڑھنے کے بعد ہم پر کسی حد تک یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں کسر نفسی اور عجز وانکساری کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا۔

اس کے بعد کے خطوں میں طنز ومزاح ملتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ غالب خط نویسی کا یہ رنگ ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لائے تھے اور اپنے ساتھ ہی قبر میں لے گئے۔

دراصل ان کے خطوط کے پڑھنے کے بعد ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ ناول نگاری کے میدان میں طبع آزمائی کرتے تو عین ممکن تھا کہ وہ نہ صرف اپنے ہم عصروں کو بلکہ اپنے بعد آنے والوں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے کیونکہ ہمیں ان کے خطوط میں وہ تمام خصوصیات ملتی ہیں جو ایک ناول میں ہونی چاہئیں۔ ان کے خط کے آغاز کے ساتھ کہانی کا آغاز ہوتا ہے بالکل ناول کی طرح خط کی کہانی نقطۂ عروج پر پہنچتی ہے اور ہمیشہ بخیر وخوبی کہانی یا خط کا انجام ہو جاتا ہے مکالمے کی قوت غالب میں ایسی تھی کہ اگر کوئی اجنبی بھی ان کا خط پڑھے تو سمجھے کہ وہ اسی سے مخاطب ہیں۔ عین ممکن تھا کہ اگر وہ ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھتے تو مکالمہ نگاری میں بھی نذیر احمد اور سرشار کو پیچھے چھوڑ جاتے۔

مختصراً ہم غالب کی خدمات کو اُردو نثر میں فراموش نہیں کر سکتے نہ صرف یہ بلکہ ہم انہیں ایک اچھا نثر نگار بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔

☆ ☆ ☆

''ہندوستان کی الہامی کتب دو ہیں۔ مقدس ویدا اور دیوان غالب''

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ سلطنت مغلیہ نے ہندوستان کو کیا دیا ہے؟

تو میں تین چیزوں کا نام لوں گا:

غالب، اُردو، تاج محل۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

پروفیسر دلشاد کلانچوی

غالب اور اس کی ادبی خدمات

خاندان و پیدائش:

مرزا اسد اللہ خاں بہادر المعروف بہ میرزا نوشہ المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک، نظام جنگ المتخلص بہ غالب و اسد ساتویں ماہ رجب ۱۲۱۲ھ کو بمطابق اکتوبر ۱۷۹۷ء بمقام اکبرآباد کتم عدم سے عالم وجود میں آئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام مرزا عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا تھا جو بالترتیب نواب آصف الدولہ اور سرکاری آصفی حیدرآباد دکن کی ملازمت سے فارغ ہوکر راجہ بختاور سنگھ رئیس الور کی خدمت کرتے ہوئے گڑھی کے محاصرہ ۱۸۰۲ء میں کام آئے اور اسی علاقہ راج گڈھ میں سپرد خاک کیے گئے۔ آپ کی والدہ مکرمہ عزت النساء بیگم خواجہ غلام حسین کمیدان کی دختر نیک اختر تھیں۔ تعلیم یافتہ تھیں، لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ آپ کا چھوٹا بھائی مرزا یوسف خاں ایام شباب میں مجنوں ہوگیا تھا اور اسی حالت میں ۱۸۵۷ء کی سعی انقلاب میں انتقال کیا۔ چھوٹی خانم آپ کی چھوٹی بہن تھی، چچا کا نام مرزا نصراللہ بیگ خاں تھا جو فوجی پنشن حاصل کرنے کے بعد ۱۸۰۶ء میں فوت ہوئے۔ آپ کے دادا کا نام میرزا قوقان بیگ تھا جو شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دہلی آئے اور پچاس گھوڑے اور نقارہ ونشان سے بادشاہ کے ملازم ہوئے۔ ان کی زبان بالکل ترکی تھی، وہ ہندوستان کی زبان کم بولتے تھے۔ مرزا غالب کے آباواجداد ایبک قوم کے ترک تھے، سپہ گری ان کا آبائی پیشہ تھا۔

خاندانی و ابتدائی حالات:

فوجی خدمات کے صلہ میں راجہ بختاور سنگھ رئیس الور نے دو گاؤں سیر حاصل اور کسی قدر روزینہ مرزا عبداللہ بیگ خاں کے اہل و عیال کے لیے مقرر کر دیے تھے۔

علاوہ ازیں مرزا غالب اپنے مربی اور حقیقی چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں کے وارث کی حیثیت سے اس کی رسالداری کی خدمات کے عوض سرکار انگریزی کی عملداری میں فیروز پور جھرکہ کی ریاست سے سات سو روپے سالانہ آخیر اپریل ۱۸۵۷ء تک برابر حاصل کرتے رہے مگر فتح دہلی کے بعد تین برس تک قلعے کے تعلقات کی بنا پر یہ امداد بند کر دی گئی۔ کیونکہ سرکار انگریزی انہیں شک کی نظر سے دیکھنے لگی تھی۔ نیز مکاتیب غالب کے ایک اندراج سے خیال ہوتا ہے کہ سن انقلاب ۱۸۵۷ء کے آغاز میں مرزا غالب اور نواب رامپور کے درمیان خفیہ خط و کتابت ہوئی۔ آخر کارروائی ہونے پر مرزا غالب نے اپنی بریت ثابت کر دی تو پنشن بھی پھر سے جاری ہوگئی اور گزشتہ تین سالوں کی واصلات بھی سرکار انگریزی نے عنایت کر دیں۔ لیکن اوسطاً مرزا کی پنشن مبلغ ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار سے زیادہ کبھی نہیں ہوئی۔

مرزا کے نانا کی جاگیر میں کئی دیہات شامل تھے اور آگرہ شہر میں بہت املاک تھیں۔ اس لیے شروع سے بےفکری نصیب ہوئی اور عیش امروز سے بہرۂ وافر ملا۔ بچپن کے کھیل تماشوں، جوانی کی رنگ رلیوں اور عیش وعشرت کی بہاروں میں مرزا غالب کے دن گزرے، وہ خود عنفوان شباب میں شہر کے نہایت حسین وخوشرو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے اور بڑھاپے میں بھی! مرزا کے بچپن اور عنفوان شباب کے اللے تللوں کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اگر زمانہ ناساعد نہ ہوتا تو بقول کسے داغ کی طرح کھل کھیلتا۔

تعلیم' حافظہ' خط وغیرہ:

شیخ معظم آگرہ کے نامی گرامی معلم تھے۔ مرزا غالب کو انہیں کے سامنے اپنا زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف نصیب ہوا اور نظیر اکبرآبادی سے بھی کچھ دن فیض تعلیم حاصل کیا۔ دو سال تک ایرانی زرتشتی عالم ہرمزد (مسلمان ہونے پر عبدالصمد) سے بھی فارسی زبان میں علم و بصیرت پیدا کی' عربی زبان میں صرف ونحو تک استاد سے پڑھا۔ کچھ

پرائیوٹ طور پر بھی مطالعہ کیا۔ ان کا حافظہ بھی بہت قوی تھا۔ چنانچہ قاطع برہان میں جو کچھ لکھا ہے وہ سارا مواد اپنے حافظہ سے حاصل کیا ہے۔ اکثر ایک شخص کے ذریعے کرائے پر کتابیں منگواتے اور مطالعہ کرنے کے بعد واپس کر دیتے' کبھی کوئی کتاب خرید کر نہیں پڑھی۔ الا ماشاء اللہ ساری عمر تالیف وتصنیف کرنے والے اس شخص کی یہ خصوصیت حیران کن ہے۔ آپ نہایت زود نویس اور تیز دست تھے۔ اس پر بھی آپ کا خط نہایت خوبصورت تھا۔ آپ کے خط کی طرز نستعلیق شفیعا آمیز، بہت شیریں اور دلاویز تھی۔ جیسے کسی ایرانی کا خط ہو۔

قید وسزا:

رشک' تعصب اور ذاتی رنجش کی بنا پر فیض الحسن خان کوتوال شہر دہلی عداوت رکھتا تھا ستارہ گردش میں تھا اور فتنہ گھات میں کہ ۱۸۴۷ء مطابق ۱۲۶۴ھ میں جبکہ سرسید احمد خاں کی پہلی مشہور تصنیف ''آثار الصنادید'' کاغذ سیاہی اور چھاپہ کی قید میں آئی مرزا غالب بھی کچھ بازی بد کر چوسر کھیلنے پر گرفتار ہوئے۔ کوتوال شہر کے ہاتھ بہانہ آیا۔ مجسٹریٹ مرزا کی عظمت وشخصیت سے ناواقف تھا۔ سیشن جج نے اغماض وتغافل میں عافیت جانی۔ صدر میں اپیل کرنے پر رہائی نہ ہوئی۔ چھ ماہ قید بامشقت اور دوسو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی' نہ جانے تین ماہ گزرنے پر مجسٹریٹ کے دل میں کیا خیال گزرا کہ اس نے مرزا غالب کو قید سے رہائی دلا دی۔

ملازمت:

یک صد ماہوار کے مشاہرہ پر دہلی کالج کی فارسی کی مدرسی کے لیے مرزا غالب کو بلایا گیا جب سیکرٹری نے مرزا کے حسب درجات استقبال کرنے سے انکار کر دیا تو آپ نے بھی ایسی ملازمت قبول کرنے سے جواب دے دیا۔ یہ واقعہ مرزا کی خودداری اور خود بینی پر ایک بڑی شہادت ہے' جلد ہی ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ

(۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۷ء) نے آپ کو تاریخ تیموریہ لکھنے پر مامور کیا۔ یہ کتاب مہر نیمروز کے نام سے ۱۸۵۲ء میں تصنیف و تالیف ہو کر ۱۸۵۶ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ یہ کتاب اصل تاریخ کا ایک حصہ تھی اس خدمت کے لیے ۲۵ روپے ماہوار (بقول کسے چھ سو روپے سالانہ) مقرر ہوئے علاوہ ازیں چھ پارچہ خلعت مع تین رقوم جواہر دربار عام میں مرحمت ہوئے اور خطاب نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ بہادر سے سرفراز کیا گیا۔ اس کام کے علاوہ بادشاہ کے استاد محمد ابراہیم ذوق کی وفات پر نومبر ۱۸۵۴ء سے ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا غالب کے سپرد ہوئی۔

خانگی تعلقات:

سات رجب ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸ اگست ۱۸۱۰ء کو تیرہ برس کی عمر میں مرزا غالب کا عقد نواب فخر الدولہ احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خان معروف کی چہیتی بیٹی امراؤ بیگم سے قرار پایا۔ امراؤ بیگم مرزا غالب سے دو برس چھوٹی تھیں۔ امراؤ بیگم نہایت متقی، پرہیزگار اور نماز روزے کی سخت پابند تھیں۔ گویا جس قدر مرزا غالب مذہبی معاملات میں آزاد منش تھے اسی قدر ان کی بیوی احکام مذہبی کی پابندی کرتی تھیں۔ یہاں تک اختلافات مشی نے زور پکڑا کہ بیوی کے کھانے پینے کے برتن الگ اور شوہر کے الگ مقرر ہوئے، مگر اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ ان کے تعلقات حد درجہ کشیدہ تھے، بیوی اپنے شوہر کی خدمت گزاری اور خبر گیری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتیں خاوند کی برداشت نہ کر سکتیں۔ مرزا غالب بھی اپنی جان سے بڑھ کر بیوی کی ضروریات اور اخراجات کا خیال رکھتے۔ تعلقات خوشگوار رکھنے کے لیے ہمیشہ وقت معینہ پر ایک بار ہر روز اندرون خانہ ضرور جاتے۔ البتہ باقی اور زیادہ وقت دیوان خانہ میں ہی دوستوں اور ملنے والوں کی صحبت میں گزارتے۔ مرزا غالب کو ہنسی، دل لگی اور چھیڑ چھاڑ کا لپکا تھا۔ مرزا کی یہ عادت بڑھاپے تک نہ گئی، اور امراؤ بیگم کے لیے سوہان روح بنی رہی۔ امراؤ بیگم کو مرزا غالب کی اس

بات سے چڑ سی تھی ۔ بار ہا چھوٹی چھوٹی باتوں پر میاں بیوی کی آپس میں جھپٹ ہو جاتی ، لیکن شدید اختلافات ہوتے ہوئے بھی ، دونوں ایک دوسرے سے نباہ کرتے چلے گئے ، مرزا غالب نے تو اپنے خاندان سے کہیں زیادہ تعلقات بیوی کے خاندان سے قائم رکھے ، عارف کا مرثیہ اور اس کے بیٹے باقر علی خاں اور حسین علی خاں کی پرورش اور شادی وغیرہ ان تعلقات کا بین ثبوت ہیں ۔ البتہ امراؤ بیگم غالب کی شاعری کو کوئی وقعت نہیں دیتی تھیں ۔

امراؤ بیگم کے میکے کا خیال تھا کہ مرزا اسد اللہ بیگ جوان ہو کر اپنے باپ دادا کی طرح سپہ گری اختیار کریں گے اور مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی کو میکے کا سا امیرانہ ٹھاٹھ سسرال میں بھی حاصل رہے گا ۔ مگر یہ امیدیں خاک میں مل گئیں ۔ داناؤں کا قول ہے کہ عورت کا شوہر اس کی قسمت ہے ۔ امراؤ بیگم کا شوہر اس کی پھوٹی قسمت بنا ۔ بیوگی کے علاوہ خاوند کی مالی پریشانیاں ورثے میں ملیں ۔ خاوند کا آٹھ سو روپے کا قرضہ بھی اس کی وفات پر بیوی کے نام چڑھا ۔ انہی حالات میں مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی ناز پروردہ بیٹی ، بے شوہر ، بے اولاد ، پریشان روزگار ، ایک سال بعد قمری مہینے کی ٹھیک اسی تاریخ کو جبکہ مرزا غالب کی برسی تھی ، یعنی ۲۰ ذی القعدہ ۱۲۸۶ھ مطابق ۵ فروری ۱۸۷۰ء کو اس عالم رنگ و خاک و باد سے رخصت ہو گئی ۔

اخلاق و عادات:

مرزا غالب کے اخلاق نہایت وسیع تھے ۔ ان کی وسیع المشربی ان کی انسان دوستی کی دلیل ہے ۔ مرزا غالب کے دوستوں میں انگریز ، ہندو ، شیعہ ، سنی ، کٹر مولوی اور پرانے رند سب شامل تھے اور سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے ۔ دور دور کے دوستوں کے ساتھ خط و کتابت سے ملاقات کی تقریب تھی ۔ وہ دوستوں کے دوست تھے ۔ دوستوں سے ان کی مہر و محبت ، غمخواری و یگانگت ان کے خطوط سے ظاہر ہے ۔ علاوہ برایں ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمہ فرض عین سمجھتے تھے اور اہتمام سے یہ کام سرانجام

دیتے۔ مرزا غالب کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا۔ مگر خودداری اور حفظ وضعداری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ شہر کے امراء وعمائد سے برابر کی ملاقات تھی، بازار میں کبھی پالکی یا ہوادار کے بغیر نہ نکلتے۔ شہر کے عمائد میں سے جو لوگ ان کے ہاں نہ آتے مرزا بھی کبھی ان کے مکان پر نہ جاتے۔ غربا اور فقراء سے بلا امتیاز لگاؤ تھا۔ ان کے دروازے سے کوئی سائل خالی ہاتھ نہ جاتا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے، لولے اور اپاہج مرد وعورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ جاگیردارانہ نظام کے ایک ممتاز فرد کی حیثیت سے ان میں وضعداری، شان امتیاز، حسن پرستی، انسانیت اور کنبہ پروری حد درجہ پائی جاتی تھی۔ چنانچہ بچپن کی فارغ البالی زندگی کا ایک آئیڈیل (Ideal) بن گئی۔ جسے حاصل کرنے کے لیے وہ ساری عمر کوشش کرتے رہے۔ مرزا کے مزاج میں ظرافت اس قدر موجود تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوان ناطق کے بقول حالی حیوان ظریف کہا جائے، تو بجا ہے۔ حسن بیان، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں تھا۔

مرزا غالب کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ ایک وقت بھی گوشت کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ فواکہات میں آم نہایت مرغوب تھا۔ ان کے نزدیک آم میٹھے ہوں اور بہت سے ہوں یہی ان کی خوبی ہے۔ رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی مگر مقررہ مقدار سے زیادہ کبھی نہ پیتے۔ اس بات کی پابندی کے لیے نوکر کو پوری پوری تاکید کی ہوئی تھی، وہ بھی غالب کی عادت سے واقف تھا۔

مذہب:

مرزا غالب اسلام کی حقیقت پر نہایت، پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے، میلان طبع زیادہ تر تشیع کی طرف تھا۔ ان کا اصل مذہب صلح کل تھا۔ احکام ظاہری کے پابند کم تھے۔ لیکن اسلام اور مسلمانوں کی ذلت کی کسی بات کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اور نہایت رنجیدہ خاطر ہوئے۔

شعر پڑھنے اور داد دینے کا انداز:

مرزا غالب ایک نہایت دلکش اور موثر انداز سے شعر پڑھتے تھے، بقول مولانا حالی وہ پہلی بار مصرع اولی یکبارگی پڑھ جاتے، پھر آہستہ آہستہ دہراتے اور ایک لمحہ توقف کے بعد دوسرا مصرع سناتے، جب کوئی ادا دیتا یا مصرع اٹھاتا تو مرزا کا دایاں ہاتھ بے اختیارانہ اٹھ جاتا اور بس! کوئی کیسا ہی معزز ومحترم آدمی کیوں نہ ہو۔ جب تک اس کا کوئی شعرفی الواقع مرزا کو پسند نہ آتا۔ وہ ہرگز اس کی تعریف نہ کرتے!

دوسرے شعراء کے مندرجہ ذیل اشعار بہت پسند کرتے تھے۔

سودا: دکھلایئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنس گراں کا

ذوق: اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

داغ: رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

مومن: تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اولاد:

ابتدا میں پے در پے سات بچے ہوئے مگر پندرہ ماہ سے زیادہ کوئی زندہ نہ رہا۔ لہٰذا ان کی نسبی اولاد کوئی نہ تھی، البتہ اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف (متوفی اپریل ۱۸۵۴ء بعمر ۳۵ سال) کے چھوٹے بیٹے مرزا حسین علی خاں کو اپنا متبنیٰ بنا لیا تھا اور نہایت شفقت سے اس کی پرورش کی بعد میں مرزا حسین علی خان کے بڑے بھائی مرزا باقر علی خاں کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ معنوی اولاد میں نیر ورخشاں، عارف، سالک،

مجروح، علائی، تفتہ، سیکش، عزیز، مونس، جوہر وغیرہ جیسے مقتدر اشخاص کا نام لیا جاتا ہے۔

وفات:

جوانی کے ڈھلنے پر زندگی کا لطف بھی گھٹنے لگا۔ آخری تین سال میں تو ان کی صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ چلنا پھرنا بالکل موقوف ہو گیا اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے۔ غذا بھی برائے نام رہ گئی بیماری کے دنوں میں چھ چھ سات سات دن تک اجابت نہ آتی۔ فوت ہونے سے چند روز قبل بیہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لیے افاقہ ہو جاتا۔ پھر ہوش کھو بیٹھتے۔ اسی حالت میں ۲۰ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۰ فروری ۱۸۶۹ء بعد از دو پہر ۳ ے برس ۴ ماہ کی عمر میں اس دنیائے فانی کو الوداع کہا۔ مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر ورد زبان رہا۔

دم واپسیں بر سرراہ ہے   عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

'''آہ غالب مرد'' تاریخ وفات لکھی گئی۔ جو بہ اتفاق کئی شخصوں نے ایک ساتھ لکھی۔ غالب۔

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں ان کی تجہیز وتکفین اور جنازے کی تمام رسوم اہل سنت کے موافق ادا کی گئیں اور درگارہ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہ میں اپنے خسر کے پائین انہیں سپرد خاک کیا گیا۔

غالب کی اردو شاعری:

مرزا غالب کی شاعری اکتسابی نہیں تھی، وہ تلامیذ الرحمان تھے، دس پندرہ سال کی عمر میں اردو میں لکھنے لگ گئے تھے اور پچیس سال کی عمر تک اُردو شاعری سے شغف رہا۔ پھر فطری لگاؤ اور فارسی شعر وشاعری کی قدر ومنزلت کی وجہ سے فارسی شاعری کی طرف زیادہ توجہ دی اور ۱۸۵۰ء تک یہی کیفیت رہی۔ ظہوری کا تخیل اور بیدل کا طرز پسند خاطر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ظہوری کے بہت سے اشعار غالب کے یہاں اُردو کا لباس پہننے لگے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ابتدائی اُردو کلام کا طرز بیان اُردو بول چال کے خلاف ہے۔ خیالات میں بھی کوئی لطافت نہیں معلوم

ہوتی۔ بعض اشعار پر اُردو کا اطلاق بھی مشکل سے ہو سکتا ہے مثلاً

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا

تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

ایسا کلام کیا بہ لحاظ تخیل اور بہ لحاظ الفاظ فارسی کہلانے کا زیادہ مستحق ہے۔ اس پر بھی وہ تقلید کے الزام سے بری ہیں۔ وہ غیر تقلیدی طرز کے مالک تھے۔ اپنی اس مشکل طرز خیال اور طرز بیان میں بھی ان کے ہاں جدت اور نرالا پن ہے۔ جو اس غیر معمولی اپج استعداد اور جودت طبع کو ظاہر کرتا ہے۔ عامیانہ خیالات اور محاورات سے بھی اجتناب کیا ہے۔

مرزا غالب کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔ مگر ہوا یوں کہ ان کی شہرت ان کی ریختہ کی شاعری کی وجہ سے ہوئی۔ اگر مولوی فضل حق اور مرزا جانی کے کہنے پر مرزا غالب اپنے ادق اور فارسی نما کلام میں کاٹ چھانٹ نہ کرتے اور اس طرح اس طرز کے کلام کا دو ثلث ضائع نہ کر دیتے تو شاید مرزا غالب کی فارسی شاعری اس کی عزت و عظمت کا باعث بنی رہتی مگر وہ بھی تا کجے؟

مرزا غالب نے غزل کو تہذیب کا درجہ دیا ہے ان کے کلام میں انسانی فطرت، عشق و محبت، تصوف و رندی، اخلاق و مذہب، رشک و حسرت، مایوسی و نومیدی، شکوہ وزار نالی معاملہ و شوخی، فخر و عالی ظرفی، غیرت و استقلال، منقبت و توصیف وغیرہ کے مضامین بکثرت موجود ہیں۔ زیادہ تر اچھوتے مضامین اور نئی تراکیب ہیں وہ رنج و مصیبت کے بیان میں ید طولی رکھتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حد درجہ قنوطی تھے، درحقیقت وہ نہ قنوطی تھے اور نہ رجائی، ان کے ہاں دونوں کا ایک نرالا امتزاج ہے۔ ان کے کلام میں امید و بیم، آرزو و شکست آرزو، عیش و غم، مسرت و حسرت کی رنگا رنگی ملتی ہے۔ اُردو شاعری میں غالب پہلے شخص ہیں جنہوں نے طنز میں خدا کو مخاطب کیا ہے۔ ان کی فی البدیہ کوئی بے نظیر مثال چکنی ڈلی کی تعریف میں لکھا ہوا وہ قطعہ ہے جو آپ نے ۲۰ فروری

۱۸۲۸ء کوتیس سال کی عمر میں کلکتہ کی ایک مجلس میں کہا تھا۔ مرزا غالب نے اردو شاعری کو فلسفیانہ خیالات سے مالا مال کیا اور ایسے خیالات کے اظہار کے قابل بھی بنایا۔ بقول کسے اگر غالب نہ ہوتے تو اقبال بھی نہ ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا غالب نے ہی اردو نظم کو (اور نثر کو بھی) دلبری بھی دی ہے اور دلیری بھی! غزل کے موجودہ ارتقاء کے وقت اور ہماری شعراء کی مجلس میں غالب اب بھی ایک شریک غالب کی حیثیت کے مالک ہیں۔ مرزا غالب کا اسلوب اردو شاعری کو گہرے فلسفیانہ، سیاسی اور علمی افکار سے آشنا کراتا ہے۔ ان کی شاعری تصور، آہنگ اور ادا سے بھرپور ہے اور فلسفی، ادیب، مصور اور فنکار سبھی کو متاثر کرتی ہے۔

غزل کا آرٹ، مسلسل اور مربوط، تعمیری اور منظم فکر کے لیے موزوں نہیں ہے۔ یہ اشاروں کی دنیا، یہ کنائے اور لطیف و نازک رمز کی بستی، کسی واضح روشن اور مقصدی نظریے کی متحمل نہیں ہو سکتی، غزل گو شاعر کوئی ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے ہاں کوئی فلسفہ ڈھونڈنا بیکار ہے۔ مرزا غالب نے بھی کوئی فلسفہ پیش نہیں کیا۔ البتہ ان کی شاعری کا مطالعہ ہمارے اندر ایک وسعت نظر ضرور پیدا کرتا ہے۔ وہ ہمیں رسوم و قیود سے آزاد کرتا ہے۔ انسانی شخصیت کی پر پیچ راہوں میں پروشنی دکھاتا ہے۔ ماضی پرستی سے روکتا اور انفرادیت سکھاتا ہے اور ہمیں زندگی کے مصائب و آلام پر کڑھنے اور کراہنے کی بجائے ایک حوصلہ اور جرأت عطا کرتا ہے۔

مرزا غالب کا دیوان اُردو پہلے پہل اکتوبر ۱۸۴۱ء میں طبع ہوا تھا۔ اس میں ۱۰۹۵ اشعار درج تھے، دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۵ء میں اور تیسرا ایڈیشن ۱۸۶۰ء میں زیور طباعت سے مزین ہوا۔ اس کے بعد اس کے بے شمار ایڈیشن چھپے ہیں اور چھپتے رہیں گے، آخری اُردو غزل ۱۸۶۶ء میں لکھی تھی۔

خصوصیات کلام اُردو:

مرزا غالب کے اردو کلام میں جدت مضامین اور طرفگی خیالات کی فراوانی ہے۔ مرزا غالب نے نئی نئی تشبیہات وترکیب اور انوکھا پیرانہ بیان تراش کیا ہے۔

استعارہ، کنایہ، تمثیل کے آسودہ استعمال سے کلام میں ندرت پیدا کی ہے۔

شوخی وظرافت اور زندگی کے جیتے جاگتے مسائل سے کلام کو رنگین و دلنشین بنا دیا ہے۔

ابتذال، عمومیت اور تقلید سے ہمیشہ ہمیشہ بچنے کی کوشش کی ہے۔

اکثر اشعار کا بیان پہلو دار ہے، انہیں جتنا زیادہ پڑھا اور سوچا جائے اتنے زیادہ لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں۔

غالب کی اُردو نثر:

شعر جذبہ کی مصوری کے لیے مخصوص ہے اور نثر خیال کی جلوہ گری کے لیے۔ مرزا غالب نظم ونثر کی اس رمز سے واقف تھے۔ انہوں نے دونوں سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ خصوصاً نثر اُردو میں مرزا غالب نے کافی شہرت حاصل کی ہے۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے محاورے، فقرے، ترکیبیں اکثر فارسی کے بطن سے نمودار ہوئے ہیں لیکن باوجود اس کے مرزا غالب اور ان کے معاصرین کی فارسیت میں بعد المشرقین ہے۔ مرزا غالب کی فارسیت اُردو نثر میں اضافہ کا باعث ہوئی ہے۔ ان کے معاصرین کی فارسیت اُردو نثر کے راہ ترقی میں رکاوٹ بنی ہے۔ اگر مرزا غالب اپنا سارا زور اُردو ہی پر صرف کرتے، تو وہ اس کی کچھ اور گرانمایہ خدمات سرانجام دے سکتے۔ اسی لیے ایک نقاد نے کہا ہے کہ اُردو نثر کا مستقبل فورٹ ولیم کلکتہ سے نہیں۔ بلکہ قلعۂ معلی دہلی سے وابستہ تھا۔ اور اس لحاظ سے اُردو نثر کا پہلا قابل قدر نمونہ میر امن مصنف باغ و بہار (تصنیف ۰۲۔۱۸۰۱ء) نے نہیں بلکہ غالب نے پیش کیا ہے۔

مرزا غالب کی نثری سرمایہ اردو میں زیادہ تر خطوط اور رقعات ہیں۔ چند

تقریظیں، کچھ دیباچے، اور تین رسالے لطائف غیبی تیغ تیز اور نامہ غالب بھی اس سرمایہ میں شامل ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ ولطف انگیز ان کے خطوط ہیں۔ انہوں نے جو کچھ محسوس کیا ہے وہی لکھا ہے۔ خطوط کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ کوئی بات ایسی نہ لکھتے کہ مکتوب الیہ ہوتا اسے پڑھ کر محظوظ اور خوش نہ تا۔ پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا اس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خطوط میں شوخیاں کرتے، یہاں تک کہ رنج وافسردگی کا بیان بھی شوخی کا پہلو لیے ہوئے ہوتا۔ رطب ویابس سے پوری طرح احتراز کیا۔ القاب وآداب میں اختصار اور دلچسپی قائم کی۔ چنانچہ ان کے خطوط میں کسی قسم کی بے ربطی نہیں طوالت نہیں۔ پرواز خیال نہیں ابہام یا تضاد نہیں بعض خطوں میں یاس وحسرت وافسردگی اور دنیا کی بے ثباتی وبے اعتباری کا بیان نہایت مؤثر طریقے میں کیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

''ارے میری جان! یہ وہ دلی نہیں ہے۔ جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلی نہیں ہے۔ جس میں تم نے علم حاصل کیا ہے، وہ دلی نہیں، جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلی نہیں ہے۔ جس میں سات برس کی عمر میں آتا جاتا تھا۔ وہ دلی نہیں جس سے اکیاون برس سے مقیم ہوں''۔

ان الفاظ میں پورے اکیاون برس کا تجربہ، ان کا ادراک، ان کا شعور، اس ٹکڑے منتقل ہو گیا ہے۔ اور مرثیہ دہلی ہوا ہے۔

مرزا غالب نے بعض اُردو خطوں اور تقریظوں میں مسجع ومقفی عبارت لکھنے کا التزام بھی کیا ہے۔ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے وہ بغیر ان تکلفات باردہ کے ہرگز خوش نہ ہوتے تھے۔ مقفی عبارت میں وہی خطوط لکھے ہیں۔ جن سے ہنسی، ظرافت اور مخاطب کو ان باتوں سے خوش کرنا مقصود ہوتا ہے۔

مرزا غالب کی انشاء پردازی کا مقابلہ مولانا ابوالکلام آزاد کی انشاء پردازی سے کیا جاتا ہے۔ مگر مولانا کے خطوں میں روانی، آزادی اختصار تینوں کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ دوسرے ان کے خطوط میں وہ معصومیت ہی نہیں ہے۔ جو مرزا غالب کو اس قدر ہردل عزیز بنائے ہوئے ہے۔

یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ مرزا غالب کو شعر گوئی سے نفرت ہوتی گئی تھی۔ چنانچہ مرنے سے چند روز پہلے آپ نثر کی طرف زیادہ وجہ صرف کرنے لگے، نثر میں ایک قصہ بھی لکھنا شروع کر دیا تھا جو نامکمل رہا۔ وہ نثر کے وسعت دامانی کے قائل تھے۔ ویسے بھی سہولت کے علاوہ نثر میں اجتماعی مسائل کے اظہار کی صلاحیت بھی کہیں زیادہ پائی جاتی ہے۔

غالب کی اُردو تصانیف:

۱۔ دیوان اُردو، طبع اول ۱۸۴۱ء بہت مختصر اور ہردل عزیز ہے۔ سینکڑوں ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

۲۔ لطائف غیبی، نوشتہ ۱۸۶۴ء ورق قاطع کے جواب میں بیس لطائف اور ۴۳ صفحوں کا ایک رسالہ ہے۔

اگرچہ میاں داد خاں سیاح کے نام سے چھپا ہے۔ مگر اس کی زبان، روانی وسلاست اور اس کی طنز و استہزا میں غالب کا رنگ غالب ہے۔ یا خود تصنیف کی ہے یا اس کی اصلاح و ترمیم میں مرزا غالب کا کافی دخل ہے۔

۳۔ نامۂ غالب، طبع اول ۱۸۶۵ء یہ رسالہ ایک خط کی صورت میں مقاطع برہان کے جواب میں لکھا گیا۔ اب عود ہندی میں شامل ہے۔

۴۔ عود ہندی، طبع اول ۱۱۵ کتوبر ۱۸۶۸ء ۱۴۵ خطوط پر مشتمل ہے۔ وفات غالب سے چار ماہ قبل شائع ہو چکی تھی۔

۵۔ اُردوئے معلیٰ (ہر دو حصص) مرزا غالب کی وفات سے ۱۹ دن بعد یعنی ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو شائع ہوئی۔ ۴۷۰ خطوں کا مجموعہ ہے۔ کچھ تقریظیں وغیرہ بھی شامل ہیں۔

نوٹ: خطوط اور رقعات ابھی تک اکٹھے کیے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مکاتیب غالب، آثار غالب، نوادر غالب، نادر خطوط غالب، متفرقات غالب وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

غالب کا ادبی مرتبہ:

مرزا غالب کا ادبی لحاظ سے ہر جہتی مرتبہ متعین کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف ہر صنف نظم ونثر پر قلم اٹھایا ہے بلکہ وہ بیک وقت شاعر بھی تھے اور ادیب بھی، فنی نقاد بھی تھے، اور تنگ نظر نکتہ چیں بھی، صوفی صافی بھی تھے اور رند شاہد باز بھی، بہت بڑے فنکار بھی تھے اور عامیانہ سطح کے اخلاقی خامکار بھی تھے شاعر کی حیثیت سے وہ ایک خاص انفرادیت کے مالک تھے۔ اردو نثر میں انہوں نے ایک خاص سٹائل ایجاد کی تھی جو اپنے وقت کی نرالی اور جرأت آزما چیز تھی۔ ان کی اس سادہ، صاف اور سلیس سٹائل نے اُردو زبان کے ایک جدید سکول کی صورت اختیار کر لی ہے۔ حالی وشبلی اسی سکول کے پروردہ ہیں۔ موجودہ دور میں ابوالکلام آزاد جیسا پر جلال ادیب، نیاز فتح پوری جیسا نقاد وانشاء پرداز اور عبدالماجد دریا آبادی جیسا شیریں مقال اور رئیس التحریر مرزا غالب کا اثر لیے ہوئے ہیں۔ مولانا عبدالحق بھی اسی زمرہ میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔

اگرچہ دیوان غالب بہت مختصر مجموعہ کلام ہے۔ مگر وہ ایک شگفتہ اور رنگین گلدستہ ہے۔ موضوعات ومعانی کا ایک ہشت پہلو آئینہ ہے۔ جس میں فلسفے کے گنجلک اور پر پیچ موز بھی نظر آئیں گے، اور نفسیاتی گتھیوں کے پیچیدہ نکات بھی اور معرفت وحقیقت کے اسرار کھلتے ملیں گے اور غم عشق اور غم روزگار سے گاہ بچنے، گاہ ٹکرانے اور گاہ کترانے کی

بے چین خواہشات کا بھی احساس ملے گا۔ ایک ادیبہ لکھتی ہیں کہ اس میں معنی کی دل نشینیوں اور الفاظ کی گنگا جمنی رنگینیوں کی لہریں اٹھتی نظر آتی ہیں ۔لیکن مرزا غالب کے کلام کے الہامی اور وید مقدس کے ہم پایہ ہونے کا ثبوت مشکل سے کہیں ملے گا دل بھی کبھی قبول نہیں کرتا کہ غالب جیسے خوش طبع، خوش مزاج، خوش دل، رنگیں بیاں، رنگیں دماغ اور رنگین مزاج انسان کو پیر تارک دنیا اور زاہد خشک کا خطاب دیا جائے ۔ان کی مقبولیت کا راز ان کے فلسفہ اور تصوف میں نہیں ہے۔ ان کی مقبولیت کا راز داخلی کیفیات کی مصوری، رنگین جذبات کی تصویر کشی، نفس انسانی کی مدھم آواز اور قلب انسانی کی دھیمی دھڑکنوں کو حسین الفاظ کے پیکر میں پیش کرنے میں ہے۔ ان کا دیوان الہامی کتابوں کے ہم پلہ نہیں ۔ بلکہ دنیوی رنگا رنگ کے بوٹوں اور نظر افروز غنچوں کا ایک رنگین چمنستان ہے۔ جس میں کہیں کہیں عارفانہ اور فلسفیانہ رنگ کے پھول بھی کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ طنز وظرافت میں بھی مرزا غالب نے ایک مقرر حیثیت قائم کی ہے۔انہوں نے اپنی اس حیثیت سے ادبی دھارے کا رخ ہی موڑ دیا۔ ورنہ شاید میر کی زبان نہ غالب کے بیان کو سنبھال سکتی اور نہ اقبال کے بیان کو۔

مرزا غالب ادب کے قائل نہ تھے۔ بلکہ آئینہ ادب میں وہ زندگی اور اس کے حقائق کی جھلکیاں پیش کرنا چاہتے تھے۔ان کی ان تمام خصوصیات پر دنیا نے بھر پور نگاہ ڈالی ہے، ان کو چمکایا اور پھیلایا ہے اور ان کی تشہیر بھی کی ہے۔اب دنیا جان گئی ہے کہ غالب کے کلام اور فن میں زندگی، زور اور کشش اتنی ہے کہ مستقبل کا انقلاب اس کو فنا نہیں کرسکتا۔

غالب کی شخصیت و عظمت:

شخصیت کی تعمیر میں مزاج اور ذہن دونوں کو دخل ہے مرزا غالب کی شخصیت بھی فکر و احساس کی آماجگاہ ہے۔ ان کے ہاں شدت احساس بھی ہے اور قوت ادراک بھی، وہ

آلام روزگار سے جہاں متاثر ہیں وہاں ان کا فکر انہیں مردانہ وار ان شدائد کے مقابلے کی دعوت بھی دیتا ہے۔ ان کی شخصیت کا راز ان کی غیر معمولی فکری صلاحیتیں ہیں۔ ان کی شکایت میں شکر ہے، غربت میں تعمیر ہے، یاس میں آس ہے اور افسردگی میں جوش ہے۔ مرزا غالب کی شخصیت ایک مغل شخصیت کی انانیت کی حامل ہے۔ ویسے بھی انانیت انسانی فطرت کا سب سے زیادہ تابناک جوہر ہے۔ یہ اثبات خود ہے۔ غالب بھی خود بیں ہیں۔ خود پسند ہیں آزاد منش ہیں۔ جو بالترتیب عزت نفس غیرت اور خودداری کا ثبوت ہیں۔ مرزا غالب خود انسان کی عظمت اور اس کی فطرت کے بے پایاں امکانات کے قائل تھے۔

مرزا غالب کے فن میں بھی ایک انفرادی شان موجود ہے۔ شعر میں جلت، انداز فکر میں بداعت، اور طرز ادا میں انوکھا پن ان کی خود پسند شخصیت کے کرشمے ہیں۔ وہ ہر بات میں جدت کے شیدائی تھے، وہ پامال راہ پر چلنا اپنی توہین سمجھتے تھے، ان کی زبان، ان کی تشبیہیں اور ان کے استعارے سب میں ایک نئی کیفیت، نیا جوش، اور نئی آن ہے ان کے لکھے ہوئے قصیدہ بھی عام شاہراہ سے الگ ہیں۔ انہوں نے غزل میں مدحہ سرائی، اور نوحہ گری کر کے قصیدہ اور مرثیہ کا کام بھی لیا ہے وہ نہ صرف جدت پسند تھے۔ بلکہ وقت پسند بھی تھے۔ ان کی ہمت دشوار پسند عشق کی دشوار منزلیں طے کرنے کی خواہش مند تھی۔ عشق جیسے آتشیں جذبہ کو مرزا غالب نے جس انداز سے پیش کیا ہے۔ اس کی خانہ ویران سازی، تباہی و بربادی، تن کاہی و زیاںکاری کو جس ڈھنگ سے دعوت دی ہے اس سے اس کی شخصیت کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے، وہ عشق و عاشق کا معیار اس شعر سے ماپتے ہیں۔

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

مرزا غالب میں حسن پرستی کا شدید احساس تھا۔ لیکن انہوں نے حسن کا تذکرہ جس خلوص اور انہماک، جس آزادی اور بے باکی، جس سادگی اور صفائی کے ساتھ کیا ہے

وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اور حسن کا یہ شدید احساس ہی ان کے عشق کا محرک ہوا تھا۔ جو ہر معتدل انسان کا ایک ناگزیر جذبہ ہے۔ بقول خود مرزا غالب نے بھی اپنی جوانی میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی سے عشق کیا تھا اور اسے مار رکھا تھا۔ وہ عشق کے ہاتھوں پیدا شدہ اذیت میں بھی بے انتہا لذت محسوس کرتے تھے۔ ان کی یہ اذیت پرستی کی صورتیں اختیار کرتی ہے۔ چنانچہ غالب کا غم بھی اس طرح ذہنی عیاشی کی مختلف روپ دھارتا ہے۔ غم عشق کی لذت سے مستی و سرشاری حاصل کرتے تھے، ان کی یہ لذت پرستی اور فراریت ان کے جاگیردارانہ ماحول کی پیداوار ہیں۔

اپنی خاندانی وجاہت اور ذاتی اہمیت وعظمت سے پیدا شدہ انانیت کی وجہ سے وہ دنیا کی ہر چیز کو (خصوصاً حسین چیز کو) اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ وہ یہ کبھی برداشت نہ کر سکتے تھے کہ کوئی دوسرا اس کا شریک غالب بنے۔ معاملات عشق میں وہ نہ صرف رقیب روسیاہ ہی پر رشک کرتے تھے۔ بلکہ خود اپنے معشوق اور اپنی ذات تک نو مورد رشک ٹھہراتے ہیں مرزا غالب کے جذبہ رشک کا ایک ادنیٰ شائبہ اس شعر میں ملاحظہ ہو۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ تیرے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

مرزا غالب کا رشک ان کی ذہنی گھتی (complex) بن گیا ہے۔ غالب کا سا رشک کسی دوسرے شاعر کے پاس نہ ملے گا۔ مرزا غالب کی شخصیت وعظمت کے لیے یہ غیرت یہ رشک لازمی امر تھا۔

غالب کی شخصیت وعظمت شمشیر و سنان اور طاؤس و رباب کے ایک حیران کن امتزاج سے تکمیل پائی ہوئی شخصیت وعظمت ہے۔ ان کی بے نیازی، اور خودداری ان کے اس نعرہ سے ظاہر ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

یہ تھی غالب کی شخصیت کی داستان جس کے متعلق رشید احمد صدیقی نے کہا ہے کہ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ سلطنت مغلیہ نے ہندوستان کو کیا دیا ہے تو میں تین چیزوں کا نام لوں گا، غالب، اُردو اور تاج محل! اور یہ تھا اس کے کلام کی مقبولیت کا راز جس کے متعلق ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نے کہا کہ ہندوستان کی الہامی کتب دو ہیں۔ ''مقدس وید'' اور ''دیوان غالب''۔

ڈاکٹر اسد اریب

غالب کی شخصیت وفن ☆

شاعری کی بنیاد اگلے زمانے کے عالموں نے اُس جذبے پر رکھی تھی، جسے واجدان کہتے ہیں۔ مگر اعلیٰ درجے کی شاعری کے لیے علم اور علم کے لیے تدبیر اظہار کی بھی ضرورت ہے۔ شاعری لڑکوں کا کھیل نہیں اور نہ ہی اُس کم ظرف بڑھیا کا کاتن ہے جو کاتا اور لے دوڑی۔ یہ مراحل صرف وہی لوگ طے کر سکتے ہیں جو موضوعہ شاعری کے بنیادی خیالات اور اس کے فکری پس منظر سے بخوبی آگاہ ہوں اور اس فلسفۂ علم کے کامل منتہی بھی ہوں۔

ایک گزشتہ اور دوسری یہ گذشتنی، ان دو صدیوں میں اردو کے تین بڑے شاعر: غالبؔ، انیسؔ اور اقبالؔ گزرے ہیں۔ ان تینوں کی کہانی، عظمت و انفرادیت کے اعتبار سے کم و بیش یکساں ہے۔ ان تینوں کی کہانی، عظمت، انفرادیت کے اعتبار سے کم و بیش یکساں ہے۔ ان تینوں نے اپنے عہد کے پرانے سانچوں کو، کاری ضربیں لگا کر اپنی جدّت پسند طبیعت کے مطابق ڈھال لیا۔

غالبؔ کا ذہن بھی ان نئے تقاضوں کی آماجگاہ رہا۔ انہوں نے اپنی عقلی برتری اور اپنے حکیمانہ شعور کی بدولت، اپنے عہد پر فتح حاصل کی۔ وہ غالبؔ رہے اور ان کا زمانہ مغلوب۔ انیسویں صدی سے لے کر آج تک جب بیسویں صدی نے شعری ارتقاء کے کئی مدارج طے کر لیے ہیں، غالب کو بلا اختلاف اور بے شک وشبہہ ایک بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے اس بڑائی میں اُس کی فرزانگی کا بھی ہاتھ ہے اور اس کی تجدد پسند طبیعت کا بھی۔

☆ یہ مضمون ''زمزمۂ شعر کی نئی آواز۔ غالب'' کے نام سے ڈاکٹر اسد اریب کی کتاب ''کانوں پر زبان'' میں شامل ہے۔

یہ وہ باتیں ہیں جن سے غالبؔ کے نئے ذہن کا پتا چلتا ہے۔ یہ وہ نیا ذہن ہے جس نے اردو شاعری کو خیالات کے ایک نئے آفاق سے آشنا کیا۔ مثنوی ہو، غزل ہو، قصیدہ، یا قطعہ فرد ہو یا مسلسل خیالات والی نظمیں، غالبؔ کی انفرادیت کا رنگ ہر جگہ نمایاں ہے۔ انہوں نے ہماری شاعری کے بعض مروج اور متواتر خیالات، اسالیب اور فکری رجحانات میں واضح تبدیلیاں کیں اور یہ تبدیلیاں اُن اساسی تصورات میں بھی برپا کیں جن پر اب تک اردو شاعری کا مدار قائم تھا۔ مثال کے طور پر یہ کہ اردو شاعری کا ''معشوق'' عاشق پر ہمیشہ سے حاوی چلا آتا تھا۔ عاشق کے مقابلے میں ''محبوب'' کی برتری ایک مسلّے کی حیثیت رکھتی تھی۔ عاجزی، معذرت خواہی اور تحقیر عاشق کا مقدر تھی۔ غالبؔ نے اُردو شاعری میں پہلی بار محبوب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا معذرت خواہی کی بجائے بازپُرس اور انکساری کی بجائے تفاخر سے کام لیا۔

عجز و نیاز عشق سے آیا نہ راہ پر
دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچئے

غالبؔ کہتے ہیں: میرا محبوب میری نیازمندی اور عاجزی سے تو مجھ پر مہربان نہ ہو، اس کے تکبّر کا اَب علاج یہی ہے کہ اُس سے مستفید ہونے کے لیے طاقت کا استعمال کیا جائے۔

نازاں ہے اپنے حسن پر مغرور وہ اسدؔ
دکھلا کے اس کو آئینہ توڑا کرے کوئی

غالبؔ کہتے ہیں: میرا محبوب آئینے میں اپنے آپ کو جس قدر دیکھتا ہے اتنا ہی مغرور ہوتا جاتا ہے۔ اب اُس کے غرور کا علاج یہی ہے کہ آئینے کو (جو اُس کے غرور کا اصل سبب ہے) توڑا جائے۔

بگڑتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو؟

غالبؔ کہتے ہیں: تمہیں تو اپنے جیسا کوئی دوسرا گوارہ ہی نہیں، خواہ آئینے میں تمہارا ہی عکسِ رُخ سہی۔ اگر کہیں خدانہ خواستہ اس بستی میں] جہاں تم ہو، کوئی ایک دوحسین اور نکل آئیں تو تمہارے غیظ وغضب کا کیا عالم ہوگا۔

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

غالبؔ کہتے ہیں: تمہاری بداخلاقی صرف مجھی پر روا نہیں۔ ہر شخص ہی تمہاری ترش روی اور سخت کلامی کا شاکی ہے۔

وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟

غالبؔ کہتے ہیں: میرا محبوب اپنے تکبّر کے سبب مجھ پر التفات نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ ملتفت نہ ہونے کا سبب اس سے پوچھوں۔ میری بلا سے التفات نہیں کرتا نہ کرے۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

غالبؔ کہتے ہیں: جب عشق ناکامی آرزو ہی کا نام ہے اور معشوق کے ستم سہنا ہی عاشق کا مقدر ہو تو پھر اے میرے محبوب یہ کیا ضرور ہے کہ تجھی سے عشق کریں؟۔

غالبؔ کو اپنے معاصر فنکاروں پر جو عقلی برتری حاصل تھی، اس کا منطقی لازمہ بھی یہی تھا کہ وہ حسرت تعمیر سے ہاتھ نہ کھینچیں۔ غالبؔ سے پہلے اُردو غزل نے کئی مرحلے طے کر لیے تھے۔ مسلسل سفر اور سفر یکساں کیفیتوں نے اس کے چہرے پر تھکن کے آثار پیدا کر دیئے تھے۔ جیسے کسی درماندر رہرد کے چہرے پر زندگی کی توانائی اور بھر پور رونق ہویدا نہیں ہوتی۔ اُردو غزل کے چہرے پر بھی اضمحلال کے یہی آثار نمایاں تھے۔ غالبؔ نے اپنی آسمانی فراست اور حکومت سے شاعری کے اس انفعال کو دُور کیا۔ اُردو غزل میں

انہوں نے جو تجربے کیے وہ تجربے اسی احساس کا حاصل ہیں۔ غزل تو پھر غزل ہے۔ اس عہد کے زمزمۂ شعری کی سب سے شیادہ دل نشین آواز، اُردو قصیدے کو بھی سنبھالا دیا۔ سوداؔ اور ذوقؔ نے قصیدے کے چہرے کو، غیر منطقی اور مصنوعی خیالات کی جس ضرب سے بگاڑ رکھا تھا۔ غالبؔ نے اس کا بھرپور علاج کیا اور تجرباتی طور پر ایک ایسا قصیدہ لکھا، جس کی تشبیب (چہرہ) کو اُردو شاعری کا فکری سرمایہ کہنا چاہیئے یہ قصیدہ (دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں) اُردو کے آفاق میں خیالات کی ایک بالکل نئی دنیا ہے۔

یہ قصیدہ امیر المومنین حضرت علیؑ کی مدح میں ہے۔ غالبؔ کو جناب امیرؑ سے جو نسبت خاص تھی اور جس قلبی تعلق کو انہوں نے ذات علیؑ سے وابستہ کر رکھا وہ عشق و سرمستی اور والہانہ شیفتگی سے بھی کہیں بڑھ کر احساس عبدیت تک جا پہنچا تھا۔ اپنے ایک فارسی شعر میں تو یہاں تک کہہ دیا ہے۔

منصور فرقہ اسد اللہیم منم
آوازۂ انا اسداللہ برافگنم

اس قصیدے میں غالبؔ نے اپنے دل کا تمام تر حال اپنے ممدوح کے آگے کھول کر رکھ دیا ہے۔ کسی طرح کی کوئی لگی لپٹی رہنے نہیں دی ہے۔ گفتنی و ناگفتنی دل کے تمام وسوسے، ذہن کی خوب و ناخوب، ہر طرح کی باتیں کہہ دی ہیں۔ بعض مقامات خیال تو اس قدر گستاخانہ ہیں کہ اگر اس سب واردات قلبی کو خود اپنی ہی زبان سے ہرزہ گوئی نہ کہہ دیتے اور معذرت خواہانہ رویے کا اظہار نہ کیا ہوتا تو بات کہیں سے کہیں جا نکلتی۔

یہ قصیدہ اپنی تشبیب کے اعتبار سے اردو کا نیا معنوی تجربہ ہے۔ اس کا ممدوح ایک ایسا شخص ہے، جو شہر علم کا دروازہ کہلاتا ہے جو علم و تقویٰ، زہد و بندگی اور عرفان و آگہی کا حکیم ہے۔ اس کے ذکر کی رعایت کا تقاضا یہ تھا کہ اُس کے قصیدے کی تشبیب کسی نئی آگہی اور عقل کے نئے استدلال پر قائم کی جاتی ہے، اس لیے غالبؔ نے ممدوح کی اس حکیمانہ نسبت اور ادراک و آگہی سے اُن سے اُن کی خصوصیت کے سبب مضامین عقل سے

بحث کی ہے۔ ان شعروں میں جو عرض مدعا سے پہلے مقدمہ خیال کے طور پر لکھے ہیں اپنے وسوسوں، یقین، عدم یقین اور عدم یقیں کے تعطل کے مسائل کو معرض بحث بنایا۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو بڑی مشکل سے نبھایا جا سکتا تھا، اس کے لیے احتیاط بیان اور جرأت کرداری کی بھی ضرورت تھی۔ غالبؔ نے مکمل اعتماد و پختہ یقین کے ساتھ اپنے ان تمام معتقدات کا اظہار کر دیا ہے جو اس کے نزدیک شک وشبہہ کی منزل میں ہیں۔ اس نے دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ بعض معتقدات کے اُن پہلوؤں پر بھی عدم اطمینان ظاہر کیا ہے۔ جن کا احاطہ عقل عمومی نہیں کر سکتی: کہا ہے

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں
بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم دُردِ یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیرو بم ہستی و عدم لغو ہے آئینہ فرق جنوں و تمکیں
نقش معنی ہمہ خمیازۂ عرض صورت سخن حق ہمہ پیانۂ ذوق و تحسیں
مثل مضمون وفا۔ باد بدست تسلیم صورت نقش قدم خاک بہ فرق تمکیں
عشق بے ربطی شیرازۂ اجزائے حواس وصل زنگار رُخ آئینہ حسن یقیں
کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز کس نے پایا اثر نالہ دلہائے حزیں

اس تشبیب میں مندرجہ ذیل مسائل اٹھائے گئے ہیں:

☆ یہ خلق عالم، محض اس غرض سے ہے کہ خلاق اپنا تماشہ دکھانا چاہتا ہے۔
☆ اس مجبور و بے اختیار زندگی کا حاصل کچھ بھی نہیں۔
☆ عقل و علم کا صلہ اور عبادت کی جزا کیا ہے۔ ہم رندوں کے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں۔
☆ کائنات میں تصور فنا و بقا ''ہے'' اور ''نہیں'' سے زیادہ کچھ نہیں۔
☆ کسی بھی شے کی اصل محض اس کا ہاتھ آنا ہے، چیزوں کا فائدہ رساں ہونا ہی اُن کا وجود ثابت کرتا ہے۔

☆ اس دنیا میں ''وفا'' ایسی نا پید اور بے حقیقت ہے جیسے کوئی کہے اس کے ہاتھ میں ہوا ہے۔ مگر ہاتھ کھولو تو وہ ہوا نہ ہو۔

☆ عشق تو محض عقل کا انتشار ہے۔ اگر وصل حاصل بھی ہو جائے تو طلب عشق کا زیاں ہے۔

☆ اس بے مروّت اور جوہر نا آشنا دنیا میں نہ تو صداقت عشق کی کوئی قیمت ہے نہ دعائے دردمندانہ کی۔

تشکیک کا یہ برملا اظہار، وہ جذباتی تموج میں بہہ کر، کر تو گیا لیکن گریز میں شاعرانہ صنائع کے ذریعہ اس بھنور سے نکلنے کی ایک خوبصورت تدبیر بھی نکال لی کہ اپنی اس گفت گو کو ہرزہ سرائی کہہ کر، ممدوح کی مدح کے لیے آمادہ ہوا جائے۔

غالب اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے غزل کے قریب تر رہ کر اظہار کے ایسے تسلسل کا التزام کیا جو مسلسل خیالات کے لیے نہایت موزوں تھا۔ اس خصوصیت کے لیے اُس نے داخلی وسائل کے علاوہ بعض معروضی رابطے بھی استعمال کیے، ردیف اور قوافی کو ایسے ڈھنگ سے برتا جو موضوعِ خیال اور جذباتی رو کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہوں اور اظہار کے معاملے میں نفسِ مضمون کی پیشوائی کریں۔ اس خوبی کی بہترین مثال وہ غزل ہے۔ جس میں عظمت بشر کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس عظمت کا مظہر خاص قرار دیا ہے اور کہا ہے۔ اصل ہستی میں ہوں مخلوق میں میرے آگے کسی کی پیش نہیں جا سکتی۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا میرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستی اشیاء مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

نفسیاتی رُجحان کے تسلسل کو برقرار رکھنے اور فکری سلیقے کو ہموار و یکساں کرنے والی غزلیں وہ ہیں، جن میں غالب کی شاعرانہ عظمت کا سراغ ملتا ہے۔ ان غزلوں کو ملاحظہ کیجئے تو اک عظیم تر غالبؔ ہاتھ آتا ہے۔ ایسی چند غزلیں وہ ہیں، جن کی ابتداء درج ذیل مطلعوں سے ہوتی ہے۔

ع درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

ع رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

ع مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

ع ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر۔ سو خموش ہے

ع عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

یہ وہ غزلیں ہیں جن میں طبیعت کے یکساں رجحان کو غلبہ حاصل ہے۔ ان میں خیالات کی بے ربطی اور ذہنی تلون کی کوئی کیفیت نہیں۔ نہ ان میں کوئی فکری ژولیدگی ہے۔ نہ خیالات کا کوئی تصادم ہے۔ ہر غزل واقعات وواردات کے کسے ہوئے سانچے میں ملتی ہے۔ شعور کی سطح ہموار رکھنے کے لیے تخاطب کی ضمیریں بھی ان میں یکساں ہیں۔

اظہار مضمون میں لہجے کی نثری خصوصیات کو قائم رکھنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ ایسے لفظوں کا بند و بست ہے جو عام طور پر جملوں کی نثری ساخت میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ لفظ صرف لفظ ہی نہیں، مکمل کلمے کی صورت میں، لہجے کے مختلف وقفوں میں رابطے کا کام بھی سرانجام دیتے ہیں۔

''کیا ہے''۔ کیوں ہو''! کیوں نہ ہو۔ اچھا نہ جانیں''۔ ''تھا کیا''۔ ''ہو کیوں''؟۔ ''سہی کیونکر ہو'' اسی قبیل کے کلمات ہیں۔

درج ذیل مثالوں میں لہجے کی ان خصوصیات کو ملاحظہ کیجئے:

ع نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

ع اُس فتنہ خو کے دَر سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ، قیامت ہی کیوں نہ ہو؟

ع قفس میں ہوں اگر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نو اسنجانِ گلشن کو

ع گھر میں تھا کیا؟ کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

ع بہت سہی، غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے

ع بگڑتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

بعض غزلیں تو خیالات کے ایسے ربط وضبط اور بیان کے تسلسل سے لکھی گئی ہیں، جن میں زمانے کے ایک بھرپور وحدت کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے ماضی کی بازیابی کے جذباتی عمل والی یہ غزلیں۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمک داں کیے ہوئے

وہ فراق اور وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ وسال کہاں

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شور سودائے خط وخال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں؟

ہم سے چھوٹا قمار خانہ عشق
واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

ان غزلوں کا جو لسانی سانچہ ڈھالا گیا ہے۔ اُس میں جذبات کی مکمل کہانی ملتی ہے اور اس کہانی کو جس طرح کہا گیا ہے وہ نثری لب ولہجے کا خوبصورت اسلوب معلوم ہوتا ہے۔

غزل کی ایک روایت یہ بھی تھی کہ اپنے جذبے کو براہِ راست اپنی زبان سے ادا نہ کیا جائے۔ اس اظہار کے کئی تمثیلی پردے تھے۔ یہ حجاب دراصل تہذیبی حجاب تھا۔ جس نے عشق کی ہوس ناکی اور شاعرانہ رندی کو علی الاعلان ہونے سے روکا۔ اسی جذبے نے محبوب کا تشخص بھی قائم نہیں ہونے دیا۔ لیکن غالبؔ نے اس تشخص کو قائم رکھا۔ براہِ راست اظہار بھی کیا۔ بعض غزلیں تو اس حد تک راست اظہار کا ذریعہ بن گئی ہیں کہ اُن کو

متکلم حاضر کے لہجے میں لکھا گیا، جیسے یہ غزلیں

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں
ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نے دانۂ فتادہ ہوں۔ نے دامِ چیدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز وئے ناشنیدہ ہوں
اہلِ وَرع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے حلقے میں مَیں برگزیدہ ہوں

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی
میر ہونے میں ہے کیا رسوائی — اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی

اشعارِ غزل کی ایک معروضی صورت یہ بھی ہے کہ وہ باہم معنوی وفکری مشابہت نہ رکھتے ہوں۔ غزل کے شعروں کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ وہ مسلسل اور مربوط نہ ہوں طشتِ غزل میں وہ لخت لخت دکھائی دیں۔ لیکن غزل میں امکانی وحدتوں کے برقرار رکھنے کا جو تجربہ غالب نے کیا وہ اتنا مقبول اور کامیاب ہوا کہ اردو شاعری اپنا مزاج تبدیل کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ چنانچہ آج کی نئی غزل کلاسیکی غزل سے بالکل علیحدہ دکھائی دینے لگی۔ اس امتیاز کو وحدتِ افکار کے عمل نے تعمیر کیا ہے۔ غالب کے بعد فانی اور پھر فانی کے بعد اقبال کے ہاں اس حسن کی جلوہ سامانی عام ہے۔ ان شاعروں کی بعض

غزلیں تو اس حد تک فکری تسلسل واقعات کا ربط، تخیل کی یک رنگی اور تاثر کی وحدت لیے ہیں کہ انہیں آج کے نئے شعری تجربوں کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔

غالبؔ اُردو غزل کا پہلا نمایاں شاعر ہے جس نے غزل میں خیالات کی وحدت اور معانی کی یک رنگی کو قائم رکھا۔ یہ شعری تجربہ اس دور کے مصحفیؔ اور آتشؔ کے ہاں بھی ہے لیکن اس میں باقاعدگی نہیں ملتی۔ غالبؔ کے دور میں اس تجربے کی ایک صورت کا نام قطعہ بند (ق) بھی تھا۔ اگر خیال غزل سے باہر ایک الگ اکائی کی صورت میں ہوتا تو قطعہ کہلاتا تھا اور اگر غزل کے اندر واقع ہوتا تو قطعہ بند کہا جاتا۔ دیوانِ غالب میں ایسے کئی تجربے ملتے ہیں، غزلوں میں بھی اور غزلوں سے باہر بھی۔ اس تجربے کی نشان دہی کا سب سے بہتر مقام وہ ہے جہاں قیدِ ہستی کے ذکر کو بنیاد بنا کر یہ کہا گیا ہے۔

دل۔ حسرتِ آرزو کا گہوارہ اور روح کا سرچشمہ ہے۔ جسم نے اسے اپنا قیدی بنا رکھا ہے۔ یہ روح کے باغِ رضوان کا طائرِ خوش نصیب! قیدِ ہستی میں ناحق گرفتار ہو گیا۔ اس کی آزادی تو پرواز میں تھی۔ جس دن اسے سوزِ ہستی نے جلا دیا، اس طائر کے نئے پر وہاں نکل آئیں گے اور یہ طوبیٰ کی طرف پرواز کر جائے گا۔

مکمل اشعار یہ ہیں:

اٹھا اِک دن بگولا سا جو میں کچھ جوشِ وحشت میں
پھرا آسیمہ سر گھبرا گیا تھا۔ جی بیاباں سے

نظر آیا مجھے اِک طائرِ مجروح و پربستہ
ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ ۔ دیوارِ گلستاں سے

کہا مَیں نے کہ ادنا کام۔ آخر ماجرا کیا ہے
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے؟

ہنسا کچھ کھل کھلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا
تو یوں رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے

کہا میں صید ہوں اس کا کہ جس کے دام گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر۔ روز آ کر باغ رضواں سے

اُسی کی زلف و رخ کا دھیان ہے شام وسحر مجھ کو
نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ کچھ ہے کام ایماں سے

بچشم غور جو دیکھا۔ مرا ہی طائر دل تھا.....
کہ جل کر ہو گیا تھا خاک اپنی آہ سوزاں سے

از ''نسخہ طاہر''

یہی وہ فکری اور فنی راہیں ہیں جہاں غالب کے قدموں کے نشاں الگ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ شاعری کے نگار خانے میں نئی تصویر پر شاعری کے زمزمے کی نئی آواز ہے۔

محمد سلطان

غالبؔ کا فارسی کلام

شہنشاہ اقلیم سخن مرزا اسد اللہ خان غالبؔ اپنے اُردو کلام کی عظمت و رفعت کے باعث فلکِ شاعری پر انجمِ درخشندہ کی طرح تابندہ ہوئے۔ معروف نقاد اور محقق ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے بقول غالبؔ کا اُردو دیوان ہندوستان کی الہامی کتابوں میں سے ہے مگر خود غالبؔ کو اپنے اُردو کلام کی نسبت اپنے فارسی کلام کی رفعت کا زیادہ احساس تھا۔ فرماتے ہیں۔

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہای رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ من است

غالبؔ کے فارسی کلام کے محاسن کے بیان سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اسلوب بیان کے بارے میں کچھ تحریر کیا جائے غالبؔ کا تعلق ادبیاتِ فارسی کے دقیق شعری اُسلوب ''سبک ہندی'' سے ہے۔ سبکِ ہندی کا مختصر پس منظر یہ ہے کہ جب فارسی ادب پر ترکی اندازِ فکر اثر انداز ہوا تو شاعری کی ایک نئی روایت قائم ہوئی نئے اسلوب کی خصوصیات یہ تھیں کہ کلمات، تراکیب اور اصطلاحات تو وہی ایرانی رہیں، لیکن اندازِ فکر رُومی ہو گیا یہ مخصوص انداز ''خیال بندی'' کہلاتا ہے۔ خیال بندی ترکوں کے مزاج کا خاصہ تھا جیسا کہ ترکی شاعری سے پتہ چلتا ہے۔ خیال بندی کا یہی اُسلوب بعد میں سبکِ ہندی کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ اسلوب دوسرے اسلیبِ شاعری یعنی سبک عراقی اور سبک خراسانی سے بالکل مختلف ہے فارسی کے معروف شعراء، عرفی شیرازی، کلیم کاشانی، صاحب تبریزی، نظیری نیشاپوری، بیدل، غنی کاشمیری، اور اسد اللہ خاں غالبؔ سبکِ ہندی

سے تعلق رکھنے والے عظیم سخنور ہیں۔ سبک ہندی میں کنایات و استعارات کا کثرت استعمال اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ کلیم کاشانی کہتے ہیں۔

شب آدینہ بدریوزہ میخانہ روم
زانکہ در ہفتہ ہمین شب ا میافتد

(ترجمہ) میں سب جمعہ کو گداگری کے لیے میخانہ کا رخ کرتا ہوں۔ کیونکہ ہفتے میں یہی رات فقیر کے حصے میں آتی ہے۔

شاعر شب جمعہ (یعنی جمعہ سے پہلے کی رات، جمعرات کی رات) خیرات لینے کے لیے میخانے کا رُخ کرتا ہے کیونکہ اُسے اسی رات ہی نوازا جاتا ہے میخانہ سے مُراد میخانۂ معرفت ہے۔ شاعر کو جمعرات کی شب کو ہی بادۂ معرفتِ حق سے مشرف کیا جاتا ہے جمعرات کو خیرات کرنے کی روایت شعراء کے ہاں ازمنۂ قدیم سے ہے اسی طرح غنی کاشمیری کہتے ہیں۔

طفلِ اشکم گربازی رَوَد بصحرا
کاغذِ بادی شمارد ابرِ دریا بار را

(ترجمہ) اگر میرے آنسوؤں کا بچہ کھیلنے کے لیے صحرا میں چلا جائے تو وہ وسیع و عریض بارش برسانے والے بادل کو بھی محض ایک پتنگ سمجھے۔

اس شعر میں شاعر نے اپنے رونے کا ذکر کیا ہے یعنی اس کے رونے کے سامنے ''ابرِ دریابار'' کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ سبک ہندی کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ایسے دقیق مضامین بیان کیے جاتے ہیں جن کا ذکر گزشتہ شعراء کے کلام میں نہیں ہوتا۔ مرزا عبدالقادر بیدل فرماتے ہیں۔

دنیا اگر دہند نہ جنبم زجای خویش
من حنائے قناعت بستہ ام بپاری خویش

(ترجمہ) اگر مجھے دنیا کی تمام نعمتیں مل جائیں تو بھی میں اپنی جگہ سے نہ ہلوں کیونکہ میں نے اپنے پاؤں پر قناعت کی مہندی لگا رکھی ہے۔ قناعت کی مہندی بہت خوبصورت خیال ہے یعنی چلنے سے مہندی جاتی رہے گی اور قناعت کا تصور ختم ہو جائے گا۔

اسی طرح کلیم کاشانی کا ایک اور شعر ہے۔

خوش ہوای سالمی دارد دیارِ نیستی
ساکنانش جملہ یکتا پیرہن خوابیدہ اند

(ترجمہ) شاعر کہتا ہے نیستی (نہ ہونا، عدم وجود) ہستی سے بہتر ہے جس طرح عام لوگ خوش گوار ہوا میں ایک کپڑے میں سوتے ہیں، مُردے بھی اپنے کفن یعنی ایک ہی کپڑے میں خوِ خواب ہیں۔

دمیدانہ و بالید و آشیاں گہ شد
در انتظار ہما دام چیدنم بنگر

(ترجمہ) دانہ اُگا اور بڑھ کر ایک درخت بن گیا۔ ہما کے انتظار میں میرا جال بچھانا دیکھ۔

یعنی ہُما کا شکار کرنے کے لیے ہم نے جال بچھایا اور دانہ ڈالا۔ جب دانہ بڑھ کر درخت کی صورت اختیار کر گیا تو درخت پر پرندوں نے آشیاں بنا لیے۔ لیکن شاعر بدستور ہما کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ شاعر طویل عرصے سے حصول مراد کے لیے کوشاں ہے۔ اسی سادہ سے خیال کو سبکِ ہندی کے پُر پیچ طریقے پر بیان کیا گیا ہے۔

سبکِ ہندی کے ایک اور نامور شاعر نظیری نیشاپوری فرماتے ہیں۔

زفرق تابقدم ہرکجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دلی می کشد کہ جا اینجاست

اس شعر میں شاعر نے محبوب کی وجدانی صفات کو مجسم صورت میں پیش کیا ہے سر سے پاؤں تک جدھر نظر اُٹھتی ہے، کرشمہ دامن دل پکڑ کر کھینچتا ہے کہ

بس یہیں کے ہو رہو۔ سبکِ ہندی کی ایک خصوصیت تجسیم (Personification) بھی ہے۔ غمزہ وادا کرشمہ و ناز جیسی وجدانی اور خیالی باتوں کو مجسم صورت میں پیش کیا گیا۔

غالب کے فارسی کلام میں سبکِ ہندی کی تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ بحرِ غالب کے چند دُر ہائے ناسفتہ ملاحظہ ہوں۔

جنون محمل بصحرای تحیر رانده☆ است امشت
نگہ در چشم و آہم در جگر وامانده است امشت

معلوم ہوتا ہے کہ شاعر آج رات ناقۂ سیّار پر سوار عازم بمنزل مقصود ہے۔ شاعر پر جنون (Lunacy) کی ایسی کیفیت طاری ہے کہ اس نے ناقۂ کے کجاوے میں سوار شاعر کو حیرت و استعجاب کے صحرا میں ہانک دیا ہے شاعر کی کیفیتِ تحیر ایسی ہے جیسا کہ اس کی نگاہ آنکھ تک ہی اور اس کی آہ جگر تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے اور اُسے اظہار کا موقع ہی نہ ملا۔

بقدر شام ہجرانش درازی باد عمرش را
فلک نیز از کواکب سبحہ ہا گر دانده است امشت

شاعر دعا کرتا ہے کہ محبوب کی عمر شب ہجراں جیسی طویل ہو جو کبھی ختم ہونے میں ہی نہیں آتی آسمان بھی رات ستاروں کی تسبیح گھما رہا ہے اس تخیل عمیق کا کیا کہنا!

غالبؔ کے فارسی کلام میں ذاتی احساسات اور تجربات کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ چونکہ اُن کی زندگی تلخیوں سے بھرپور تھی اس لیے اُن کا کلام سوز و گداز سے عبارت ہے۔

چو صبح سن زسیاہی بشام مانند است
چہ گوئیم کہ زشب چند رفت یا چند است

☆ انتخاب غالبؔ تصحیح امتیاز علی عرشی میں یہ لفظ ''رانده'' ہے اور شعر کا مفہوم بھی اسی سے واضح ہوتا ہے بعض نسخوں میں حتیٰ کہ بی اے کی درسی کتاب میں بھی یہ لفظ ''مانده'' جو کہ غلط ہے۔

جب شاعر کی صبح ہی شامِ غم کی مانند تاریک ہے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کتنی رات گزری ہے اور کتنی باقی ہے۔

سوخت جگر تا کجا رنجِ چکیدن دہیم
رنگ شو، ای خون گرم! تاپر یدن دہیم

جگر جل گیا، ہم کہاں تک رنج کو (خون کی صورت میں) ٹپکنے دیں۔ اے گرم خون تو رنگ بن جاتا کہ مجھے اُڑنے دیں۔ رنگ اُڑنا شدید اضطراب کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔

سیہای غم، کہ چہرہ بہ خوناب شُستہ ایم
از دیدہ، نقشِ وسوسۂ خواب شُستہ ایم

شاعر کی راتیں غم سے بھر پور ہیں شاعر کہتا ہے کہ ہم نے اپنا چہرہ خُون کے آنسوؤں سے دھویا ہے ہم نے اپنی آنکھوں سے سونے کے تصور کے نقوش تک کو دھوڈالا ہے۔ یعنی حُزن وملاک کی اس شدید کیفیت میں نیند آنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اسے سے یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ غالبؔ قنوطیت پسند (Pessimist) ہیں۔ وہ تلخ حقائق کے شاکی ضرور ہیں، مگر اُن کے ہاں مصائب و آلام کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے (   ) کا فلسفہ بھی پایا جاتا ہے۔ زندگی کی کٹھن وادی میں چلتے چلتے جب اُن کے پاؤں جواب دے جاتے ہیں تو وہ سینے کے بل چلنا شروع کرتے ہیں۔

بوادی کہ دراں خضر راعصا خفت است
بسینہ می پریم رہ، اگرچہ پا خفت است

جس وادی میں چلتے چلتے حضرت خضرؑ کا عصا جواب دے جاتا ہے (حالانکہ اُن کے متعلق ہے کہ مسافروں کی رہنمائی فرماتے ہیں) شاعری اِس وادی میں سفر جاری رکھنے

کے لیے سینے کے بل چلنا شروع کرتا ہے اگر چہ اُس کے پاؤں سو چکے ہیں۔

وازیٔ شب و بیداریٔ من، این ہمہ نیست
زبختِ من خبر آرید، تا کجا خفت است

شاعر کہتا ہے کہ شب غم کی طوالت اور مسلسل بیداری کا سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔ میری قسمت کی خبر لاؤ کہ وہ کہاں سوئی ہوئی ہے۔ غالبؔ غم کو تربیت انسانی کا ذریعہ گردانتے ہیں جو لوگ وادیٔ غم کے منازل طے کرتے ہیں، وہ بالآخر مقام ارفع سے سرفراز ہوجاتے ہیں۔

قضا درکار رہا اندازۂ ہرکس نگہ دارد
بقطعِ وادیٔ غم می گمارد تیز گاماں را

قضاء قدر اپنے کاموں میں ہر شخص (کی قیمت) کے اندازے کا خیال رکھتی ہے۔ تیز چلنے والے لوگوں کو ہی وادیٔ غم کی مسافت طے کرنے کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ غالبؔ کے فارسی کلام میں رُموزِ تصوف اور فلسفیانہ توجیہات بھی بدرجہ اُتم موجود ہیں۔ تصوف کے میدان میں غالبؔ قدیم نظریہ ''ہمہ اوست'' یا وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ تمام مظاہر فطرت حقیقت میں صفاتِ ربانی ہیں، جو ہمیں مجسم صورت میں نظر آتی ہیں۔ گویا وحدت کثرت کی صورت میں نظر آتی ہے۔ یہ کثرت محض فریب نظر ہے۔

غرق محیط وحدت صرفیم درنظر
ازروی بحر، موجہ و گرداب گشتہ ایم

شاعر دنیا اور موجودات کو لہروں اور گرداب سے تشبیہہ دیتا ہے جن کا خارجی وجود کچھ عرصے کے لیے ہمیں نظر آتا ہے لیکن جب یہ خارجی وجود نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے تو حقیقت مطلق یعنی سمندر باقی رہ جاتی ہے۔ شاعر حقیقت مطلق کو سمندر سے تشبیہہ دیتا ہے۔

آن راز کہ درسینہ نہانست نہ وعظ است
بردر توان گفت بہ منبر نتواں گفت

ہمارے سینے کی گہرائیوں میں ایک ایسا راز بھی ہے جو صرف تختۂ دار پر افشا کیا جا سکتا ہے اور اسے وعظ کی طرح منبر پر کھڑے ہو کر افشا نہیں کیا جا سکتا اس شعر میں عظیم صوفی منصور بن حلاج کے نعرۂ ''انا لحق'' کی طرف واضح اشارہ ہے۔

در کشاکشِ ضعفم نگسلد رواں از تن

این کہ من نمی میرم ہم زنا تو انیہاست

میرا دل تسبیح، مصلٰے اور چادر کے تصور سے لرز جاتا ہے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ راہزن بیدار ہے اور پارسا سویا ہوا ہے۔ راہزن سے مراد ابلیس ہے جو ہر روپ میں انسان کو گمراہ کرتا ہے۔ شاعر پرہیز گاروں کو تلبیسِ ابلیس سے خبردار کرتا ہے۔

گزشتہ کار من از رشکِ غیر شرمت باد

بزم وصل تو خود را ندیدنم بنگر

یہ شعر بھی اسرارِ تصوف سے متصف ہے شاعر کہتا ہے کہ غیر کے رشک کے باعث میرا کام گزر گیا، یعنی میں معرفت حق سے محروم رہا۔ شاعر اپنے آپ کو شرم دلاتا ہے۔ مگر بعد ازاں تصوف و طریقت کی منزل طے کر کے شاعر کے قلب میں انوار ربانی کا نزول ہوتا ہے۔ شاعر بزمِ حق میں اپنے آپ کو (یعنی غیر اللہ کو) نہیں دیکھتا اور کہتا ہے اب میرا اپنے آپ کو نہ دیکھنا دیکھو کہ میں صوفی کامل بن گیا ہوں اور فنا فی اللہ کا تصور پیش کر رہا ہوں۔

علاوہ ازیں غالبؔ کے فارسی کلام میں اور بہت قابل غور پہلو ہیں۔ شعر ذیل میں محبوب کے حسب وعدہ نہ پہنچنے پر اپنی قلبی واردات خوبصورت استعارات و کنایات میں بیان کی ہے۔

بذوق وعدہ سامان نشاطی کردہ پندارم

زفرشِ گل بروی آتشم بنشاندہ است اِمشت

شاعر محبوب کے وعدے کے مطابق سامان نشاط تیار کرتا ہے۔ اور جب محبوب

نہیں پہنچتا تو اُسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُسے فرش گل سے آگ پر بٹھادیا گیا ہو۔ شعرِ ذیل شاعر کی قوت متخیلہ اور تجسیم (Personification) کی بہترین مثال ہے۔

تا در آب افتادہ عکس قد دلجویش
چشمہ ہمچو آئینہ فارغ از روا نیہاست

جب محبوب سروقد کا عکس چشمے کے آبِ شفاف پر پڑتا ہے تو اس کی تاثیر سے چشمہ بھی آئینے کی طرح جامد ہوجاتا ہے اور پانی کی روانی ختم ہوجاتی ہے اور محبوب کی تصویر اس پر ضوفشاں ہوجاتی ہے۔

مندرجہ ذیل شعر موسیقیت کی حسین مثال ہے۔ حروف کی تکرار اور ہم آہنگی کے امتزاج کے باعث نغمے کی سی شان پیدا ہوگئی ہے۔

زمن بجرمِ تپیدن کنارہ می کر دی
بیا بخاکِ من و آر میرنم بنگر

(اے محبوب! تو نے تڑپنے کے جرم میں مجھ سے کنارہ کشی کرلی اور اب میں تیری جدائی کے غم میں تڑپتا ہوا مرگیا ہوں تو میری قبر پر آ اور میرے آرام کرنے کا منظر دیکھ)۔

غالبؔ کے بعض فارسی اشعار میں بہت نرالے اور دُور رس افکار ائے جاتے ہیں۔

تا چہ سنجم دوزخ و کوثر؟ کہ من تیز این چنین
آتشی در سینہ و آبی بساغر دا شتم

شاعر دوزخ اور حوض کوثر کا اندازہ کرسکتا ہے، کیونکہ وہ بھی اپنی دنیائے شاعری میں یہی کیفیات رکھتا ہے۔ اُس کے سینے میں آگ ہے اور ساغر میں شراب ہے۔ قصہ مختصر، غالب کا فارسی کلام اتنا متنوع اور رنگا رنگ ہے کہ اس میں دنیا کا، اہل فکر، اہل دانش، اہل بصیرت، اہل نظر اور اہل دل اپنی پسند کے موافق بہترین سے بہترین مضامین تلاش کرسکتا ہے۔

میں اسی مضمون کو غالب کی عظیم، خوبصورت نعت رسول مقبول پر ختم کرتا ہوں۔ درج ذیل اشعار سے ہویدا ہے کہ شاعر پیغمبر آخر الزماں محمد مصطفےٰ ﷺ کو کس والہانہ نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہے۔

حق جلوہ گرز طرز بیان محمد ست
آری کلام حق بزبان محمد ست

معجزہ قرآن کے وحی الٰہی ہونے کی طرف اشارہ۔

آئینہ دار پر توِ مہرست، ماہتاب
شانِ حق آشکار زشانِ محمد ست

جس طرح چاند کی روشنی سورج کی روشنی سے ہے ہی طرح شانِ حق کو محمد ہی نے کائنات میں متعارف کرایا۔

دانی، اگر بمعنیٔ ''لولاک'' واری
خود، چہ از حق است، ازانِ محمد ست

بنگر دو نیمہ گشتن ماہ تمام را
کہ آن نیمہ جنبشی زبنانِ محمد است

معجزہ شق القمر کی طرف اشار

تیر قضا، آئینہ، در ترکش حق است
اما کشادِ آن زکمانِ محمد ست

ہر کس قسم، بدانچہ عزیز است، میخورد
سو گند کردگار بجان محمد ست

واعظ، حدیثِ سایہ طوبیٰ ' دگذاست
کہ انیجا سخن زرسروِ روانِ محمد ست

سایۂ محمد کے سامنے سایہ طوبیٰ (بہشت کے ایک درخت کا نام) کی کوئی حیثیت نہیں)

ورخود زنقش مُہر نبوت سخن رَوَد
آن نیز نامور زنشان محمد ست

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ نیر دان گزاشتیم
کہ کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد ست

❀❀❀

جمیل احمد خان

غالب کا تصورِ عشق

غالب کے تصورِ عشق کی بنیادیں تمام تر مادیت اور جنیت پر استوار نہیں اور ان کے ہاں جو عشق پایا جاتا ہے وہ انسانی جذبہ کا اظہار ہے غالب نے حسن کی جو تصویر پیش کی ہے۔ وہ پیکر خیال ہی ہے۔ یوں اپنے عمل کے لحاظ سے عشق کی سب صورتیں مجازی ہوتی ہیں اور جس چیز کو عرفِ عام میں عشق حقیقی کہا جاتا ہے وہ بھی عشق مجازی کی ایک صورت ہے غالب نے مجاز کی شدید پرستش و توصیف کی ہے اور اس مسلسل توصیف میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جو انسان کو زندگی سے بیزار کر دے۔ زندگی غالب کو بہت عزیز تھی۔ زندگی بسر کرنا ہی ان کے نزدیک سب کچھ تھا۔ ان کے نزدیک زندگی مسرتوں، دل فریبیوں اور دل آویزیوں کے مجموعہ کا نام تھی۔

حسن نظر، حسن کو دیکھنے کی صلاحیت حد سے زیادہ تھی ان کا تخیل اس احساس میں رنگ آمیزی کر کے اسے بہت زیادہ حسین بنا دیتا تھا ان اشعار میں دیکھئے غالب نے کتنے خوب صورت اور پیارے محبوب کا تصور پیش کیا ہے۔

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام ہر ہوس
زلف سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ سے ہے گلستاں کیے ہوئے
جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

غالب کے تصورِ حسن میں وحشت بر گشتگی کی کیفیت نہیں ملتی بلکہ ایک خوبصورت اور صحت مندانہ نادیہ نگاہ ملتا ہے غالب میں کھو جانے کا انداز اور حسن سے وابستگی کا احساس بہت زیادہ ہے، ان میں جمع کے قریب جاتے اور لطف حاصل کرنے کا خیال بہت نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے وصل اوری سے متعلقات کا بیان کیا ہے تو وہ معاملہ قیدی کی حد پر پہنچ گئے۔ مثلاً

ساقیا دے ایک ہی ساغر میں سب کو مئے کہ آج
آرزوئے بوسۂ ہائے لب میگوں ہے مجھے

لیکن اس کے باوجود غالب کے یہاں معاملہ بندی صرف ذہنی تعیش کے لیے نہیں ملتی متعلقات وصل کے بیان میں ایک رنگینی اور پُر لطف فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ محبوب کے تصور کے ساتھ غالب کے یہاں درد و کرب پیدا نہیں ہوتا بلکہ ایک قسم کا احساس نشان پیدا ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ غالب کے یہاں غم سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ جب بھی انہوں نے حسن وعشق کی کیفیات بیان کی ہیں غم دوراں کا خیال ان کی نظروں سے غائب نہیں ہوتا۔ جب بھی انہوں نے حسن وعشق کی کیفیات بیان کی ہیں غم دوراں کا خیال ان کی نظروں سے غالب نہیں ہوا بلکہ اسی غم کے سہارے اپنی عشقیہ شاعری میں رومان اور حقیقت کا سنگم بنایا۔ ان کے یہاں لذت کے احساس اور تعیش کے خیال کے باوجود ایک طرح کا وقار اور رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے۔ جو آرزوئے نشاط کے ساتھ حساسِ غم کا حسین امتزاج کا نتیجہ ہے۔

غم اگرچہ جاں گسلی ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غم عشق جگر نہ ہوتا غم روز گار ہوتا

گو میں رہا رہین ستم ہائے روز گار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

اس قسم کے اشعار میں مرزا غالب نے مختلف عشقیہ کیفیات و معاملات کا ذکر کیا ہے لیکن ایسے اشعار تمام تر جذباتی نہیں بلکہ ان میں عقل و شعور بھی کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے معاملات و کیفیات کو زندگی کی الجھنوں سے دور کر کے نہیں دیکھا بلکہ ان کا عشق ایک وسیع پس منظر رکھتا ہے اور وہ پس منظر یہ ہے کہ غالب تمام عمر عیش کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہے، مگر اس ساری جستجو اور سرگردانی کا انجام مایوسی اور افسردگی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ زندگی نے ہر ہر منزل پر ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور انہیں احساسِ تنہائی و محرومی بڑی شدت سے ستاتا رہا۔ زندگی کو وہ پانے لیے سمجھتے رہے مگر زندگی انہیں اپنا نہ سمجھتی تھی۔ اور یہی سبب ہے کہ ان کے پاس حسرتوں اور ناکامیوں کا ایک ہجوم ملتا ہے وہ زندگی بھر کڑھتے رہے۔ اور جس چیز کی جتنی تمنا تھی وہ انہیں اتنی نہ مل سکتی جبھی وہ پکار اُٹھے ۔

ہزاروں خواہش ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے میرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ان اشعار کے پس پردہ ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون ہے جو غالب کی زندگی میں سب سے نمایاں تھا۔ ان حسرتوں کے محرک وہ خارجی و داخلی حالات تھے جنہوں نے سیاسی ، انتشار اور معاشی افراتفری پیدا کر دی تھی غالب انہی حالات کے زخم خوردہ تھے اسی لیے وہ چلا اُٹھے۔ ۔

مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں
وہ دبوئے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

غالب رئیس زادے تھے اور جاہ و ثروت کی فضا میں آنکھ کھولی تھی وہ زندگی کو

صرف پھولوں کی سیج سمجھتے رہے مگر جب سماجی اور معاشی حالات بگڑے اور افلاس نے قرض کے دروازے وا کر دیئے تو تلملا اُٹھے اس راہ میں انہیں ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ راستہ کی ناہمواری کے باعث ٹھوکریں کھاتے، گرتے اور سنبھلتے رہے، یہاں تک کہ یہ زندگی ختم ہوگئی۔

جب بھی انہیں تنہائی کا احساس ہوتا وہ حسن اور اس کے تصور کو رونقِ محفل بنا لیتے اور اس کے سہارے زندگی کے تلخ حقائق کا مقابلے کرتے رہے۔ ان کا یہ قصیدہ تھا کہ حسن کے ساتھ لگاؤ سے جو رشتہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی کا نام عشق ہے اور وہ اس عشق کے تصور کو ایک بنیادی انسانی جذبہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس جذبہ کے بغیر انسان تکمیل کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ نشہ نشاط سے بھرپور بھی ہے اور عاصی سے انسان سرور بھی ہے۔ غالبؔ کے نزدیک عشق کی راہ میں ایسے مراحل بھی پیش آتے ہیں جو بظاہر خاصے تکلیف دہ ہوتے ہیں لیکن وہ ان میں بھی لطف کے پہلو نکال لیتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں انسان ان مراحل سے گزر کر وصول کی منزل سے ہم کنار ہوتا ہے جہاں پہنچ کر اس پر خوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب عشق کو زندگی کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں ان کے خیال میں عشق سے رونق آتی ہے۔ ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا

رونقِ ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن، بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذت آزار بھی نہیں

غالب کے یہاں عشق کا تصور بہت بلند اور ارفع قسم کا ہے جن میں انسانی بلندی کے خیال کو نمایاں جگہ حاصل ہے۔ ان کے خیال میں انسان عشق کر کے مکمل ہوتا ہے اور

عشق کرنا ہی رفعتِ انسان کی دلیل ہے اس لیے مرزا غالب عشق کے لیے عاشق کی خودداری لازمی قرار دیتے ہیں، اسی لیے محبوب کے مقابلے میں غالب کے یہاں عشق کرنے والے کی اہمیت کچھ کم نہیں۔

خون ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

ایک اور جگہ انہوں نے محبوب کے مقابلے میں عاشق کو انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تیری عادت ہی سہی

غالب کے خیال میں تکمیل میں عاشق اور محبوب یکساں کردار ادا کرتے ہیں اس لیے وہ عاشق کا کم رتبہ نہیں سمجھتے ان کی شاعری میں، انانیت کا پہلو غالب ہے جو دراصل عشق کرنے کی انفرادیت اور لطیف احساسات کو واضح کرتا ہے غالب کے یہاں انسان کی عظمت و بلندی کا تصور نمایاں ہے۔ اسی لیے عاشق کو ذلیل نہیں سمجھتے بلکہ وہ اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
وفا کیسی؟ کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو
واں وہ غرور غمزہ و نیاز، یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں

ان اشعار میں غالب کے تصورِ عشق کی روح مل جاتی ہے اور ساتھ ہی عاشق کی انفرادیت اور اس کی اہمیت کو سب سے زیادہ عزیز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں تصورِ عشق میں وہ سپردگی اور ایثار کے جذباتی خیالات نہیں ملتے، جو ان سے قبل اُردو غزل میں عام تھے۔ انہوں نے اس کی عمارت سنگین اور ٹھوس حقائق کی بنیاد پر استوار کی اس لیے ان کے عشق میں زندگی کے ساتھ ایک مطابقت نظر آتی ہے غالب بنیادی طور پر روحانی شاعر ضرور ہیں لیکن انہوں نے اس کے ساتھ حقیقت اس طرح ہم آہنگ کر دی ہے کہ حقیقی رنگ سامنے آ جاتا ہے۔

تیرے وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

اس لیے غالب کے یہاں عشق کی جن واردات اور کیفیات کا بیان ہے ان میں مبالغہ آرائی کو دخل نہیں انہوں نے قلبی وارث اور بے شمار جذبات کو غزل میں سمو دیا ہے اور اس میں زندگی کی تڑپ کو اُجاگر کیا ہے کیوں کہ یہی کیفیات دراصل انسانی زندگی کے جذباتی پہلو کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے
خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

دیوانِ غالب اس قسم کے اشعار سے بھرا پڑا ہے، ایسی ان گنت کیفیات ہیں جو انسانی دل کے باطن کو ظاہر کر دیتی ہیں۔ یہ سب انسانی نفسیات کی مختلف کیفیتیں ہیں جن کو غالب نے واضح کیا ہے۔

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

(غالبؒ)

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

(غالبؒ)

بخود گزیدہ و محکم چوں کوہساران زی

چوں خس مزی کہ ہوا تند و شعلہ بیباک است

(اقبالؒ)

نزاکت ہا است در آغوش بنیان خانۂ حیرت

مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشہ را

(میرؒ)

محمد جمیل اختر بھٹی

مرزا غالب اور ان کی پر لطف شاعری

وہ کون اُردو دان ہے۔ جو شہنشاہ سخن مرزا اسد اللہ خان غالب کی شخصیت سے نا آشنا ہے؟ یا ان کی شاعری کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔

اگرچہ اس عظیم شاعر کے ابتدائی حالات پردۂ اخفا میں ہیں۔ تاہم ان کی شاعری میں بعض بعض جگہوں پر پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے لڑکپن میں زندگی کیسے کاٹی۔ عہد شباب کیسے گزارا؟ اور پیری میں ان کا کیا حال تھا۔ گویا ان کی شاعری ان کی زندگی کی آئینہ دار ہے۔ جس سے مرزا غالب کی شخصیت اور ان کی زیست کے متعلق بخوبی پتا لگ سکتا ہے۔

مثلاً انہوں نے مندرجہ ذیل شعر میں اپنی تعلیم کا ذکر کیا ہے۔ جس میں مزاحیہ چاشنی بھی ہے اور حقیقت بھی۔

لیتا ہوں ''مکتب غم دل'' میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ ''رفت'' گیا اور ''بود'' تھا

اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا غالب اتنے خواندہ آدمی نہیں تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں نہ تو سکولوں کا رواج تھا، نہ کالجوں کا۔ بعض بعض جگہوں پر شاذ و نادر درس و تدریس کے لیے مکتب ہوتے تھے مرزا غالب نے جہاں تعلیم حاصل کی، اس مکتب کا نام ہی ''غم دل'' تھا۔ جو بعد میں حقیقت بن کر رہ گیا۔ یعنی مرزا غالب نے تمام عمر ''غم دل'' میں گزاری بالفاظ دیگر اپنی تمام زندگی غم عشق میں کاٹی۔

کسب وہنر:

آپ نے کوئی خاص ہنر نہیں سیکھا تھا۔ نہ ہی آپ کسی خاص کام کے اہل بنے۔ مثلاً انہوں نے کہا ہے۔

ہم کہاں کے دانا تھے۔ کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

آپ نے مصوری سیکھی تو عشق کے لیے اور اگر منشی کا کام کیا تو صرف محبوب تک رسائی اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے۔ کیونکہ آپ کھلم کھلا محبوب کو خط نہیں لکھ سکتے تھے اس لیے انہوں ں ے خط نویسی کا طریقہ اختیار کیا۔

اگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

بعض جگہوں پر آپ نے گداگری کا ذکر کیا ہے۔ شاید آپ نے کسی وقت گداگری کا پیشہ بھی اختیار کیا تھا۔ لیکن پھر بھی عشق کو نہ چھوڑا اور ایک بھکاری کی مانند محبوب کے دروازے سے وصل کی بھیک مانگتے رہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

عہد شباب وقفس عشق:

مرزا غالب کے اکثر شعر ''قفس۔ طائر۔ آشیانہ۔ چمن و دیگر تشبیہوں پر مشتمل ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو گرفتار شدہ طائر اسیر تصور کرتے ہوئے کہا ہے۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کو عین شباب میں عشق جیسے زبردست حریف سے نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔ آخر منہ کی کھانی پڑی۔ لاکھوں پھڑ پھڑائے اور ہزاروں بچ نکلنے کی چالیں سوچیں۔ لیکن دام محبت تنگ ہی تنگ ہوتا گیا۔ چنانچہ خود ہی اعتراف کرتے ہیں۔

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

غالب اور محبوب:

گرچہ قسام ازل کی طرف سے مرزا صاحب کو کوئی اچھا نصیب نہیں ملا تھا۔ لیکن پھر بھی محبوب پرستی ان کا شیوہ بن چکا تھا۔ اپنی بدصورتی اور حسینوں کے بارے میں کہتے ہیں۔

چاہتے ہیں خوبروؤں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

جب دنیا کی الجھنوں سے اکتا گئے اور زمانہ کے جھمیلوں سے دل برداشتہ ہوئے تو جی میں ٹھانی کہ

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

موت:

اپنی موت کے خیال سے مرزا غالب کو ایک سکون اور تشفی حاصل ہوتی ہے چنانچہ ایک جگہ پر اپنے آپ کو مردہ تصور کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

یہ نعش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مرجانے کے بعد جب اپنے آپ کو خدائے لم یزل کے سامنے بطور ایک مجرم کے دیکھتے ہیں تو فرماتے ہیں۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے میرے گنہہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

جب آپ کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے تو یاس امیز لہجہ میں کہتے ہیں۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

کلام غالب پر مختصر تبصرہ:

مرزا غالب کے کلام پر سینکڑوں تبصرے لکھے جا چکے ہیں۔ چند خصوصیات یہاں گنائی جاتی ہیں۔

- مرزا غالب کے کلام میں گرم جوشی اور بلا کی شوخی پائی جاتی ہے۔
- آپ کے مقابلے کا شاعر بیدل تصور کیا جا سکتا ہے۔ یا جرمنی کا شاعر گوئٹے۔
- غالب غیر معمولی قوت تخیل اور قوت فکر کا مالک تھا۔
- غالب کے کلام میں سوز و ساز حیات کا رنگ پایا جاتا ہے۔
- غالب اس دنیا میں حسن مطلق کے دیدار کا آرزومند تھا۔ اس لیے اُس کے کلام میں اُس کی جستجو کا تصور جابجا پایا جاتا ہے۔
- اس کے کلام میں حافظ اور سعدی کی سی سرمستی اور حلاوت موجود ہے۔
- آپ کا کلام اکثر فارسی رنگ میں ہے۔ چنانچہ خود اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔

فارسی بیں تا بہ بنی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ من است

سید محمد ادریس عزم نجمی

کلامِ غالبؔ کی تضمینیں

ایک دن مرزا غالب کی مشہور غزل ''درد منت کش دوا نہ ہوا'' گنگنا رہا تھا کہ غیر شعوری طور پر اس غزل کے مطلع پر ایک مصرع ۰ نزول ہوگیا۔ پھر تو جی چاہا کہ اس کی تضمین کیجئے۔ چنانچہ اس کے آٹھ اشعار کی تضمین ہوگئی تضمین کے بعد اتفاق سے میری نظر پروفیسر حامد حسن قادری صاحب کی تصنیف نقد و نظر (جس سے بدقسمتی سے میں اب تک بہرہ ور نہ ہو سکا تھا) پر پڑی۔ اس میں قادری صاحب کا ایک تبصرہ کلام غالبؔ کی تضمینوں پر بھی تھا۔ خوش قسمتی سے اس میں اس غزل کی تضمین بھی زیر بحث نظر آئی۔ چار شعرا نے اس پر خمسے کہے ہیں جن میں میر مہدی مجروحؔ غالبؔ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ قادری صاحب نے اس پر خوب تبصرہ کیا ہے۔ مگر یہ مختصر اور ناکافی ہے۔ اس کے علاوہ ان سے کہیں تسامح بھی ہوگیا ہے۔ لہٰذا خیال آیا کہ ان تضمینوں اور ان پر قادری صاحب کے تبصرہ کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے۔

قادری صاحب فرماتے ہیں:

''غالبؔ کی بعض غزلیں جو اوروں نے بھی تضمینیں کی ہیں۔ اُن سے مرزا عزیزؔ بیگ کا مقابلہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔ صرف ایک غزل ایسی ہے جس کے چار خمسے میرے پیش نظر ہیں۔ میر مہدی مجروحؔ، مرزا عزیزؔ بیگ، صبؔا اکبرآبادی کے علاوہ میں نے بھی اس پر مصرعے لگائے ہیں۔ میں نے دوسروں کی تضمینیں دیکھنے سے پہلے خمسہ لکھا تھا۔

صباؔ صاحب نے بھی بے دیکھے تضمین کی ہے۔ چند خمسے چاروں کے پیش کرتا ہوں۔

مجروحؔ: کام نخوت سے کچھ روانہ ہوا — درِ حاجت کشی پہ وا نہ ہوا
کیا حقیقت کہوں کہ کیا نہ ہوا — درد منت کشِ دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

مرزاؔ: یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا — کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا
مجھ پر احساں طبیب کا نہ ہوا — درد منت کشِ دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

صباؔ: شکر ہے مجھکو فائدہ نہ ہوا — چارہ گر باعثِ شفا نہ ہوا
خوش ہوں احسان غیر کا نہ ہوا — درد ومنت کشِ دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

قادریؔ: نام بدنام عشق کا نہ ہوا — میں بھی شرمندۂ وفا نہ ہوا
یہ بُرا کیوں ہوا بھلا نہ ہوا — درد منت کشوفا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

میر مجروح کے مصروعے میں تبرک ہی تبرک ہیں۔ مرزا صباؔ کی تضمین ہم پلہ وہم مضمون ہے اور بہت خوب ہے۔ میرا مضمون الگ ہے''۔

میرؔ صاحب کے سارے مصرعے ربط اور صرف بھرتی کے ہیں۔ افسوس کے اُن کے مصرعوں نے غالبؔ کے شعر کی ساری خوبیوں کو زائل کر دیا ہے۔ اُن کی تضمین سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انہوں نے اس شعر کو سمجھا ہی نہیں۔ مرزؔا و صبا کی تضمین ہم پلہ نہیں، صباؔ کا انداز بیان مرزا سے بہتر ہے۔ مرزا کے دوسرے مصرعے میں ''کم مرض ہی مگر'' کی ترکیب اچھی نہیں۔ قادری صاحب نے ایک نیا مضمون پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے یوں تضمین کی ہے۔

عزمؔ: شاکی جور دلربا نہ ہوا طالب مہر بے وفا نہ ہوا
دل مرا مائلِ شفا نہ ہوا درد منت کشِ وفا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

مجروح: دے خدا رحم ان حبیبوں کو کہ جلائیں نہ بد نصیبوں کو
رنج دیتے ہو ہم غریبوں کو جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

مرزاؔ: ہو گے رسوا تمہیں کہا مانو بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو
چل کے سُن لو الگ جو سنتے ہو جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

صباؔ: میرے غم سے نہ غیر واقف ہو خود ہی اس بات کو ذرا سوچو
مجھ کو بدنام دو جہاں نہ کرو جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

قادریؔ: اتنے بے درد بھی نہ بن جاؤ کہ غرض کچھ بُرے بھلے سے نہ ہو
ہے یہ آپس کی بات سوچو تو جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

مجروح کے پہلے شعر میں عام دُعا ہے۔ اگر چہ موقع کے مناسب ہے لیکن غائبانہ ہونے کے سبب تیسرے مصرعے سے بے جوڑ ہو جاتی ہے۔ مرزاؔ سہارنپوری کی تضمین بہترین اور لاجواب ہے صباؔ صاحب کا پہلا شعر خوب ہے۔ تیسرے مصرعہ میں ''دو جہان'' کا مبالغہ ضرورت سے زیادہ ہے۔

غالبؔ کے اس شعر کی صحیح تضمین کسی سے نہ ہو سکی۔ اکثر و بیشتر نے صرف غالبؔ کے پہلے مسرعہ کو ذہن میں رکھ کر تضمین کی ہے۔ مجروح کی تضمین سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس شعر کو بالکل نہیں سمجھا۔ دوسرے شعراء سے مختلف انہوں نے ''رقیبوں'' کو

قافیہ قرار دے کر تضمین کی کوشش کی ہے۔ مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ خصوصاً ''جیبوں'' کا استعمال بہت بھونڈا ہے۔ ''وے خدا رحم'' کی ترکیب بھی بہتر نہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پہلے دو مصرعے باقی مصرعوں سے بے ربط ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ایک بند کے اندر سارے مصرعے مربوط ہونے چاہئیں۔ قادری صاحب نے مرزا کی تضمین کو بہترین اور لاجواب قرار دینے میں کوئی ضرورت سے زیادہ مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے بھی غالب کے صرف پہلے مصرعے کو ذہن میں رکھ کر تضمین کی ہو۔ ویسے تضمین بُری نہیں قادری صاحب کا تیسر مصرعہ خوب ہے میرے تضمین ہے۔

عزمؔ: جس قدر چاہے تم مجھے کوسو گالیاں دو بُرا بھلا کہہ لو
ہاں مگر غیر درمیاں میں نہ ہو جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

مجروحؔ: کیوں عبث جا کے اپنا سر ٹکرائیں ناحق احسان کیوں کسی کا اٹھائیں
اس سے جب آرزوئے دل نہ ہی پائیں ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
وہ ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

مرزاؔ: اور تجھ سا حسین کہاں سے لائیں حسرت دل کی داد کس سے پائیں
کس کے ہاتھوں سے زخم دل پر کھائیں ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

صباؔ: اب کے حال دل سنانے جائیں کس کے قدموں پہ سر جھکانے جائیں
تیغ کس کی گلے لگانے جائیں ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

قادریؔ: آرزو جنت دل میں لے کر آئیں تیرے کشتے جہاں میں کہلائیں
پھر بتا کس کے در پہ سر ٹکرائیں ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

مجروؔح کے مصرعے بہت ہی اچھے ہیں، مرزا کے تیسرے مصرعے میں دل پر زخم کھانے کی قید نہ ہونی چاہیے۔ غالبؔ تو محض خنجر آزمائی کا ذکر کرتے ہیں۔ صباؔ کے مصرعے بھی موزوں ہیں۔ میری رائے میں اس شعر کی جو تضمینیں ہیں خنجر یا تیغ کا ذکر آنے کی ضرورت نہیں، غالبؔ کے شعر میں خنجر کا لفظ کافی ہے۔ تکرار بے مزہ ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے پہلے غالبؔ نے دوسرے مصرع میں (تو) کی جگہ (وہ) کیا ہوگا۔ اسی لیے مجروؔح نے ایسا لکھا ہے اس کے بعد بدل دیا ہوگا۔

اس کے علاوہ قادری صاحب کے خیالات صحیح ہیں۔ قادری صاحب کی تضمین میں تیسرا اور چوتھا مصرعہ ہم مضمون ہے۔ اس کی ضرورت نہ تھی۔ میری تضمین یہ ہے۔

عزؔم: کس کو روداد غم سنانے جائیں کس کو زخم جگر دکھانے جائیں
ٹھوکریں کس کے در کی کھانے جائیں ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی خنجر آزما نہ ہوا

مجروؔح: رکھتا لذت جو ہے وہاں حبیب شہد و مصری کو وہ کہاں ہے نصیب
کیا کہوں بات ہے عجیب و غریب کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

مرزؔا: سخن تلخ کب ہے اُن کے قریب اُن سے باتیں سنیں یہ کس کے نصیب
ہے حلاوت ہی کچھ سخن ہیں عجیب کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

صباؔ: جتنے دشنام جانتے ہیں ادیب کوئی باقی نہیں قریب قریب
پھر بھی سنتا رہا وہ ہائے نصیب کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

قادریؔ: ڈھونڈتا تھا وہ اک نہ اک تقریب کہ مزے ہوں تیرے لبوں سے نصیب
تو نہ سمجھے تو ہے یہ بات عجیب کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

مجروحؔ کی تضمین اُن کے قدیم رنگ کی ہے۔ اگلے وقتوں کے لوگ ہیں۔ مرزاؔ کا پہلا اور تیسرا مصرع ہم مضمون ہے۔ ایک کافی تھا اور تیسرا بہتر تھا۔ اس بات کو دو بار کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ صبا کے پہلے مصرع کا مضمون بے لطف ہے۔ تیسرا مصرع خوب کہا ہے۔

قادری صاحب کا تبصرہ درست ہے۔ مگر کافی نہیں۔ مجروحؔ کے پہلے مصرع میں ''رکھتا'' کی (الف) گر رہی ہے۔ تیسرا مصرع بھرتی کا ہے۔ قادری صاحب کی تضمین سب سے اچھی ہے۔ انہوں نے اچھا مضمون پیدا کیا ہے۔ میں نے یوں تضمین کی ہے۔

عزمؔ: محفلِ عشق کی ہے رسم عجیب مایہ ناز ہے عتاب حبیب
نگہ قہر ہے عروج نصیب کتنے شیریں ہے تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

مجروحؔ: فکر کی قسمت آزمانے کی یعنی اُس شوخ کو بلانے کی
یہ سنو بات دل جلانے کی ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

مرزاؔ: جب نہیں دُھن تھی اُن کے لانے کی استطاعت تھی گھر سجانے کی
اب جو بدلی ہوا زمانے کی ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

صباؔ: ہائے اے گردشو زمانے کی ہے جگہ کون سی بٹھانے کی
شکن سمجھو غریب خانے کی ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

قادریؔ: ہم نے کی فکر جب بُلانے کی اُن کو سوجھی کسی بہانے کی
اب سُنی ہے جو گھر لٹانے کی ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

مجروحؔ کے مصرعے بہت خوب ہیں۔ صرف اتنی بات ہے کہ غالبؔ نے اُن کے لکھا ہے، مجروحؔ نے (اُس شوخ) لکھ دیا ہے۔ لیکن قدیم لوگ اس کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ مرزا کے مصرعے میں تیسرا مصرعہ اچھا اور بہت اچھا ہے۔ اسی طرح صباؔ کے پہلے مصرع میں بڑی تازگی اور جدت ہے۔ دوسرے مصرع کی ضرورت نہ تھی۔ یہ مضمون تیسرے مصرع میں بہتر اور برمحل ہے۔ میں نے جب اس شعر پر غور کیا تو خیال آیا کہ غالبؔ نے گھر میں بوریا نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں بتائی اگرچہ مضمون شعر کے لیے ضرورت نہیں بات پوری ہے۔ لیکن تضمین میں اگر کوئی سبب بتا دیا جائے۔ تو لطف سے خالی نہ ہوگا۔

قادری صاحب کے خیالات صحیح ہیں۔ مجروحؔ و مرزاؔ کی تضمینیں اچھی ہیں۔ صباؔ کا پہلا مصرع خوب ہے مگر یوسف بے کارواں ہو کر رہ گیا ہے۔ قادری صاحب کی تضمین بہت خوب ہے۔ میری تضمین یہ ہے۔

عزمؔ: کوئی شے بھی نہیں ٹھکانے کی — چیز جو ہے وہ اک زمانے کی
اُن کو سوجھی ہے آزمانے کی — ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

مجروحؔ: جب سے عقل و تمیز آئی تھی — تیرے ہی در پہ جبہ سائی تھی
دمبدم عاجزی فزائی تھی — کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

مرزاؔ: جان طاعت ہی میں کھپائی تھی — کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی
سر تھا سجدہ تھا جبہ سائی تھی — کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

صبا: تیری چوکھٹ پہ جبہ سائی تھی اپنی دنیا وہیں بنائی تھی
تجھ سے اُمید دلربائی تھی کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

قادری: کیا میرے بخت کی بُرائی تھی؟ کیا ریا میری جبہ سائی تھی؟
کیا یہ کچھ شان کبریائی تھی؟ کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

مجروح نے پھر سپاٹ مصرعے لگا دیے ہیں۔''عاجزائی فزائی'' بھی کچھ خوبصورت ترکیب نہیں ہے۔ مرزا کی تضمین بے عیب ہے لیکن صبا کا خمسہ سب سے اچھا ہے۔کیا مصرع دیا ہے''اپنی دنیا وہیں بنائی تھی''۔ تیسرا مصرع بھی اس محل پر نہایت دلکش ہے میں نے اس غزل کی تضمین اسی شعر سے شروع کی تھی۔ یہ پیرایہ بیان ذہن میں آیا تھا اور یہ مصرعے لگائے تھے۔ باقی اشعار کو پھر کچھ عرصہ بعد تضمین کیا۔ میں نے اس شعر کو اس طرح تضمین کیا ہے کہ میرا ہر مصرعہ مستقل ہے اور غالب کے شعر سے پہلے رکھ کر مثلث بنا سکتا ہے۔ خمسے کے لیے تینوں اس ترتیب سے رکھے جا سکتے ہیں۔ تیسرے مصرع کا انداز شاید نیا ہو۔

غالب کے اس شعر کی بھی صحیح تضمین کسی سے نہ ہو سکی۔ یہاں بھی وہی خامی ہے کہ صرف ایک مصرع کو ذہن میں رکھ کر تضمین کی گئی۔ غالب کے مصرعہ کی صحیح کیفیت کسی سے اُجاگر نہ ہو سکی مجروح کی تضمین میں''عاجزءفزائی''ترکیب بہت بھونڈی ہے تعجب ہے کہ قادری صاحب نے مرزا کی تضمین کو بے عیب بتایا ہے۔ حالانکہ مرزا کے پہلے مصرع میں''ہی'' کی''ی'' گر رہی۔ تیسرا مصرع بہت خوب ہے مگر افسوس نباہ نہ سکے۔ صبا کے پہلے دو مصرعے اچھے ہیں ایک دلچسپ چیز یہ ہے کہ اس شعر کی تضمین میں اکثر مصرعوں کا توارد ہو گیا ہے۔ میری تضمین یہ ہے۔

عزؔم: عمر بھر تجھ سے آشنائی تھی تیری چوکھٹ پہ جبہ سائی تھی
میری طاعت میں کیا برائی تھی کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

مجروحؔ: اس کی بخشش نے کی ذرا نہ کمی کچھ تلافی پہ ہم سے ہو نہ سکی
کیا بڑی بات ہم نے کی ایسی ''جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''

مرزاؔ: قابلِ فخر کیا ہے بات اپنی عین احسان ہے اُس کی خوشنودی
ہم نے اس پر نثار کیا شے کی ''جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''

صباؔ: حسن نے اس کی زندگی بخشی عشق پر اس کے جان صدقے کی
مر گئے ہم تو کوئی بات نہ ہوئی ''جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''

قادریؔ: عمر بھر اُسے یہ آرزو تھی بڑی حق ادا کر کے ہو سبکدوشی
عمر بھر میں بڑی جو ہمت کی ''جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''

سب نے بجز صباؔ کے صرف غالبؔ کے مضمون و عبارت کو دوسرے الفاظ میں لکھ دیا ہے۔ کوئی تازگی پیدا نہیں کی۔ صباؔ صاحب نے خوب مضمون نکالا ہے ''حق ادا نہ ہونے کا حق ادا کر دیا ہے''۔

قادریؔ صاحب کے خیالات صحیح ہیں۔ مجروحؔ نے دوسرے مصرعے میں ''تلافی'' کا لفظ غلط استعمال کیا ہے۔ تلافی، پاداش، مکافات، یا نقصان کے عوض کو کہتے

ہیں۔ احسان کے بدلہ کے معنوں میں اس کا استعمال صحیح نہیں۔ صؔبا کا پہلا مصرعہ خوب ہے اور اس میں انہوں نے ایک اچھوتا مضمون پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر افسوس نباہ نہ سکے تضمین بُری نہیں۔ قادری صاحب کی تضمین میں ''عمر بھر کی تکرار'' ذوق سلیم پر گراں گزارتی ہے اس کے تیسرے مصرعے نے تضمین میں جان ڈال دی ہے۔ میری تضمین یہ ہے۔

عزؔم: کب یہ تکمیل دوستی کی تھی کون سی بات یہ خوشی کی تھی
کیا بساط اپنی زندگی کی تھی ''جان دی۔ دی ہوئی اسی کی تھی''
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''

مقطع کی تضمین کو قادرؔی صاحب نے بحث سے علیحدہ کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ''غزل کے دو شعرااور مقطع نہ خود دلچسپ ہیں۔ نہ کسی کی تضمین پُر کیف ہے''۔ بہر حال میں نے جو اس کی تضمین کی ہے۔

عزؔم: بندہ پرور مزاج کیسے ہیں؟ عزم سے آپ کیوں خفا سے ہیں
کیا ہوا؟ کیوں خموش بیٹھے ہیں؟ ''کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرانہ ہوا''

مسعود گیلانی

غالب اور غزل

شاعر کی حیثیت سے غالب ایک عظیم ہستی تھے ان کی غزل میں فنی، فکری اور جمالیاتی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ غالب سے پہلے غزل کا ایک دھڑکتا ہوا احساس دل تو تھا مگر معاملات کی اونچ نیچ کو سمجھنے اور سوچ بچار کرنے والا دماغ نہ تھا۔ غالب نے غزل کو دل کے ساتھ ساتھ دماغ سے نوازا۔ غالب نے غزل کو دل کے ساتھ ساتھ دماغ سے نوازا۔ غزل کے مضمون کو خوشنما اور رنگا رنگ کر دیا۔ غالب سے پہلے غزل میں مردہ پن پایا جاتا تھا۔ انہوں نے غزل میں یقین اور اعتماد کا عنصر شامل ہے۔ غور و فکر کی نئی نئی راہیں نکالیں۔ نئے اور اچھوتے خیالات کو جنم دیا۔

غالب جوانی میں دوستوں سے ہٹ کر چلنا پسند کرتے تھے۔ اپنی برتری حسب ونسب پر فخر یہ سب باتیں غالب میں بچپن ہی سے موجود تھیں اور ان کا دل فلسفے کو زیادہ پسند کرتا تھا کیونکہ تحلیل و تجزیہ کی قوت خدا کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔ غالب نے شاعری کے لیے کسی نئے راستے کا انتخاب نہیں کیا ان کے رنگا رنگ خیالات نے ہر صنف ونظم پر طبع آزمائی میں مدد دی۔

غالب ہمارے سامنے ہر روپ میں ظاہر ہوئے کبھی ان کے خیالات نے انہیں ولیوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا کبھی شوخ اور الھڑ بانکے تو کبھی غم و حسرت کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ ایک لمحہ کے لیے پاکیزہ خیالات کی بلندی انہیں آسمان پر چمکتے ستاروں میں کھڑا کرتی ہے اور دوسرے ہی لمحے وہ زمین پر بسنے والے حقیر انسان نظر آتے ہیں۔

غالب کو جس چیز نے انہیں دوسرے شاعروں سے اونچا مقام دیا وہ ان کی

جدت طرازی ہے۔ ان کی غزل میں ایک منفرد رنگ پایا جاتا ہے۔ انہوں نے بہت سے ایسے خیالات کا بھی اظہار کیا جو دوسروں نے بھی پیش کیے لیکن غالب نے ان سب کو ایک نئے اور اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے جو طریقہ اپنایا ہے اس میں نیا پن اور جدت کا احساس ہوتا ہے۔

جدت ادا:

ع وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا حال کیا
کہ ہوگئے مرے دیوار و در در و دیوار!

ظرافت:

غالب طبعاً آزاد تھے۔ نفسیاتی گہرائی کی وجہ سے ان میں جو لطافت اور شگفتگی پائی جاتی ہے وہ ظرافت ہی کی ایک مثال ہے۔ حالی انہی خصوصیات کی وجہ سے انہیں ''حیوان ظریف'' کہتے ہیں۔ شوخی کلام کی بہت سے مثالیں ان کے کلام میں موجود ہیں۔ مثلاً:

تم کون سے ایسے تھے کھرے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

ع پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر نہ تھا

تصوف:

غالب زندگی کے پیچھے چھپے ہوئے تجربات کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ ان پر حکیمانہ اور فلسفیانہ انداز میں نظر ڈالتے ہیں اور ہر چیز پر غور وفکر کرتے ہیں۔

ع جب کہ تجھ بن نہیں کوئی وجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ع ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

موسیقی:

غالب میں ایک اور خصوصیت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے ہم عصروں میں اونچا مقام حاصل کیا ہے وہ ہے موسیقی۔ ان کی غزلوں میں بحریں اور قافیئے ایک موسیقی رکھتے ہیں۔ مثلاً:

ع مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
ع کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو

خوش بیان:

مرزا غالب میں ایک اور ایسی بات تھی جس کی وجہ سے صاحب شعرا الہند، غالب کو حافظ کا ہم پایہ قرار دیتے ہیں۔ یہ خصوصیت ہے ان کا خوش بیان۔ مثلاً:

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

رندانہ:

غالب شراب کے بہت عادی تھے۔ انہوں نے اپنے شعروں میں شراب کو شہد سے بھی اونچا مقام دیا ہے۔

کیوں رد و قدح کرتا ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

غالب نے شراب کا سہارا محض اپنے حالات سے غافل ہونے کے لیے لیا تھا۔ ایک جگہ وہ فرماتے ہیں۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

طرفگیِ خیال:

غالب نے ہر خیال کو دوسروں سے ہٹ کر اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑے اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے فرماتے ہیں:

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

معنی آفرینی:

غالب کے دیوان میں معنی آفرینی کی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں۔

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

مسلسل اشعار:

مرزا غالب کی جس خصوصیت کی طرف کم توجہ دی گئی وہ غالب کے مسلسل اشعار ہیں:

نالہ دل شب انداز اثر نایاب تھا
تھا پسند بزم وصل غیر کو بیتاب تھا

سید اختر سعید

غالب کی اصلاحی شاعری

دنیائے ادب کی ایک عظیم شخصیت جسے مرزا غالب کہتے ہیں، آج ہم اُن کی شاعری کا ایک نیا رخ پیش کرتے ہیں جس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ عام طور پر مرزا کو صرف عشقیہ شاعری کا پیغمبر مانا جاتا ہے۔ کس حد تک غلط ہے ہمیں کہنے میں ذرہ باک نہیں کہ مرزا کے کلام میں جا بجا جو مذہبی اخلاقی مضامین ملتے ہیں وہ دوسرے شعراء کے ہاں اس کثرت سے نہیں ملتے اور اگر کسی کے ہاں اس قسم کے مضامین ملتے ہیں تو ان کا دیوان فن عروض کے اعتبار سے اتنا بلند مرتبہ نہیں جتنا کہ غالب کا ہے۔ زبان فارسی میں بلا شبہ سعدی اور حافظ کے ہاں اخلاقی شاعری کے ساتھ فصاحت و بلاغت کی تمام قدریں بھی ملتی ہیں جو شاعری کا طرہ امتیاز ہیں۔ سعدی کی باتیں تو نہایت سادہ اور سوکھی پھیکی سی ہیں مگر اثر کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سعدی سے زیادہ سادہ اور مؤثر کلام شاید دنیا کی کسی زبان میں ہو حافظ کا رنگ سعدی سے بالکل جدا ہے۔ نہ تو اس کی شاعری نصیحتوں کا پلندہ ہے اور نہ ہی سادگی کا خاموش سمندر۔ مگر اس کی شراب کے نشے میں ہی وہ سب کچھ موجود ہے جو دوسروں کے ہاں اخلاقی شاعری میں نہیں۔ مگر مرزا کا حال ان سب سے جدا ہے۔ اخلاقی موضوع چھیڑے تو محسوس ہو کہ سعدی نے نیا جنم لے لیا۔ معرفت کی باتیں کرے تو گمان ہو کہ حافظ نے اُردو میں شعر کہنے شروع کر دیے ہیں۔ الفاظ کی بندش اور موسیقی اور الفاظ پر نظر جائے تو محسوس ہو کہ ہندوستان کی گلیوں میں شیکسپیئر کی روح بھٹک رہی ہے اور علمیت پر نظر جائے تو پتا چلے کہ ملٹن کی آنکھوں میں دوبارہ بینائی آ گئی ہے۔ جذبات نگاری پر قلم اٹھائے تو لوگ کہیں کہ (Keats) کی روح اس میں منتقل ہو گئی ہے۔ ہم مرزا غالب کے کچھ اشعار اور دوسرے شعراء کے متحد المحول اشعار

بھی پیش کریں گے۔ تاکہ اندازہ ہو جائے کہ کس شاعر کا کلام پست اور کسی شاعر کا کلام بلند ہے۔ مرزا غالب پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ مگر اس موضوع پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔ ''صحیفہ ادب'' میں کچھ کوشش کی گئی ہے کہ غالب کی شاعری کے اس پہلو کو اجاگر کیا جائے۔ مگر مصنف نے اس پر اتنا سیر حاصل تبصرہ نہیں کیا جتنا کہ موضوع کی وسعت کا تقاضا ہے۔ وقت نے اگر مساعدت کی تو تفصیلاً اس سے بحث کریں گے۔ اب ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں جس سے بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ مرزا غالب کا مذہبی مطالعہ کتنا وسیع تھا۔ اس موقعہ پر ہم مرزا کی اصلاحی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

❀ مذہبی شاعری ❀ اخلاقی شاعری ❀ خودداری

مذہبی شاعری:

زبان فارسی کا مشہور شاعر جامی خاص صوفیانہ انداز میں کہتا ہے۔

ع زهفتاد و دو ملت کرد جامی رو بعشق تو
بلے عاشق ندارد مذہبی جز ترک مذھبہا

غالب نے اس مضمون کو اپنا رنگ دے کر اس میں چار چاند لگا دیے۔

ع ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ملتیں مٹ جانے کے بعد اجزائے ایمان ہونے میں جو بات ہے وہ بلے عاشق ندارد مذہبی جز ترک مذھبہا میں ہرگز نہیں۔ یا مثلاً غالب کا یہ شعر کیسے عجب انداز کا حامل ہے۔

ع وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

شاعر کا مقصود یہ ہے کہ وفاداری ایسی اچھی صفت ہے کہ کافر بھی اس کی بنا پر اچھے سلوک کا حقدار ہے اور اُس کا مرتبہ مسلمان سے کسی بھی صورت میں کم نہیں۔ یہ بات تھی جسے مرزا

نے یوں بیان کیا کہ اگر برہمن بت خانہ میں مرے تو کعبہ میں گاڑو اس شعر سے شاعر کے
مذاق کا صحیح اندازہ ہوتا ہے اور اُس کی وسعت نگاہ کا بھی پتا چلتا ہے۔ مرزا کے نزدیک
مذہب میں کوئی افسوس نہیں بلکہ انسان کی اپنی صفات اسے نیک اور بد بناتی ہیں۔ ایک اور
مقام پر مرزا کو دیکھئے بندگی پر کیسا فلسفیانہ استدلال پیش کرتے ہیں۔

ع طاعت میں تار ہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ڈاکٹر اقبال نے بھی اپنے شعر کی بنیاد اس مضمون پر رکھی ہے۔

ع سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

آپ نے دیکھا کہا یک ہی مضمون پر دونوں کے اشعار کی بنیاد ہے۔ ذرہ سی
تبدیلی سے شعر کی حیثیت میں کتنا فرق ہوگیا۔ اقبال کہتا ہے کہ اے بندہ عبادت کو سوداگری
نہ سمجھ اپنے دل سے جزا کی تمنا نکال دے کیونکہ بندگی تجارت نہیں کہ جو کام بھی کیا جائے
اس کا منافع ضرور ملے۔ غالب کا انداز بیان ان سب سے جدا ہے وہ بندگی کو اُن تمام
الائشوں سے پاک کر دیتا ہے جو انسانی دماغ میں جنم لے سکتی ہیں۔ نفس مضمون کی
خوبصورتی کے ساتھ ساتھ الفاظ کا انتخاب اور بیان کی شوخی ملاحظہ ہو۔

ع دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

خدا جانے مرزا کی شوخی بیان کا کیا حال ہوتا اگر خوشحالی میسر ہوتی۔

ع آن راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بردار تواں گفت بہ ممبر نتوان گفت

حقیقت تو یہ ہے کہ آج اگر نظیر نیشاپوری زندہ ہوتا تو اپنے تمام کلام کو جو تصوف کی جان سمجھا
جاتا ہے قربان کرتا۔ مرزا نے اسی ہمہ اوست کے فلسفہ کو اُردو میں بعینہٖ نقل کر دیا ہے۔

ع قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منظور نہیں

مرزا غالب نعرہ انا الحق کو حق سمجھتے ہوئے اس کی پیروی کو جائز خیال نہیں کرتے، خدا کو پہچاننے کے باوجود اپنے ہوش وحواس گم نہیں کرتے اور وہ راز جو قدرت نے عطا کیا عوام کو بتاتے نہیں پھرتے۔ تقدیر کے متعلق مرزا کا نظریہ دیکھیے۔

ع تقدیر بہ اندازہ ہمت ھے ازل سے
آنکھوں میں ھے وہ قطرہ جو گوھر نہ ھوا تھا

ان تمام اشعار سے جو ہم نے نقل کیے بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مرزا کا مذہبی مطالعہ کیسا وسیع تھا۔ اب ہم ان کے ایسے اشعار نقل کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا کا اخلاق کتنا بلند تھا اور اس کی اخلاقی قدریں کتنی وسیع تھیں۔ مرزا کے ہاں ہمیں اخلاق کی ایسی اچھی اور پاکیزہ مثالیں ملتی ہیں جو عام شعراء کے ہاں مشکل سے ملتی ہیں۔

اخلاقی شاعری:

زبان اُردو کے قومی اور اخلاقی شاعری کے علمبردار مولانا الطاف حسین حالی کا ایک مشہور شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ع فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اب دیکھئے مرزا نے اسے کس طرح ادا کیا ہے۔

ع بس کہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

مرزا اور حالی کے بیان میں جو فرق ہے اس کا اندازہ بچہ بھی کرسکتا ہے۔ پہلے مصرع میں مشکل اور آسان کی جو رعایت بلا تکلف استعمال میں آگئی ہے۔ اس نے شعر میں چار چاند

لگا دیے اور دوسرے مصرع میں آدمی اور انسان میں جو لطیف فرق رکھا گیا ہے۔ اس کا اندازہ تو کچھ مذاق سلیم ہی کر سکتا ہے۔ مرزا کا ایک مشہور شعر ہے۔

ع قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مال اچھا ہے

آپ نے دیکھا کہ مرزا غالب نے کس طرح اچھے اور بُرے میں امتیاز قائم رکھنے کے لیے ایک اصول مرتب کر دیا۔ اب جو شخص بھی چاہے وہ اس کسوٹی پر اپنے افعال کو پرکھ سکتا ہے۔ یہی چیز مابعد الامتیاز ہے۔ غالب اور دوسرے شعراء میں دوسرے اخلاقی شعراء قلم اٹھاتے ہیں اور نصیحت کے دفتر پہ دفتر لکھتے چلے جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے مرزا چند اشعار کہتے ہیں مگر ان کی قوت متخیلہ اور طبیعت کی اپج ایسے قوانین اور ایسے اصول مرتب کر دیتی ہے کہ آنے والی قومیں اگر چاہیں اور کوشش کریں تو اخلاقیات کے لامحدود خزانوں سے مالا مال ہو جائیں۔ مثال کے طور پر ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ جس سے اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی۔

ع رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مرزا نے اس شعر میں نصیحت کی ہے کہ تکالیف سے انسان کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ بلکہ خندہ پیشانی سے برداشت کرنا چاہیے کیونکہ ایک دن آجاتا ہے کہ یہی تکلیفیں انسان کے لیے عین راحت بن جاتی ہیں۔ مرزا کا یہ شعر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ ایسے اشعار جو ایک کایہ کا کام کریں ہزاروں سال کے تجربہ کا نچوڑ ہوئے۔ ایک اس سے قبل کا شعر ملاحظہ کیجئے اور اندازہ لگائیے کہ مرزا کو انسانی نفسیات سے کتنا گہرا تعلق ہے۔

ع عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

الطاف حسین حالی نے بھی اپنے شعر کی بنیاد اسی کلیہ پر رکھی ہے۔

ع ہوا رکتے رکتے دم آخر فنا
مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا

حالی اور غالب کے اشعار میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ حالی کا یہ کہنا کہ ''مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا'' ایک کایہ نہیں۔ برخلاف اس کے مرزا کا یہ مصرع ''درد'' کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا'' ایک مکمل کلیہ ہے۔ ان اشعار کے علاوہ مرزا کے ہاں بکثرت پند و نصائح میں ملتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ جو نصیحتیں مرزا نے عوام کے لیے کی ہیں زبان کے اعتبار سے بھی نہایت سلیس اور سادہ ہیں۔ عام طور پر مرزا کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مشکل پسند تھے اور ان کی حکومت کا احاطہ بھی یہیں تک ہے۔ یہ خیال جتنا عام ہے اس سے کہیں زیادہ غلط ہے اگر ہم ابن رشیق ہی کے معیار شعر پر اکتفا کریں تو بھی ہمیں مرزا کے کلام میں کثرت کے ساتھ سہل ممتنع کی مثالیں ملتی ہے۔ گو ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مرزا مشکل پسند تھے۔ مثال کے طور پر ہم ان کی اخلاقی شاعری سے متعلق چند شعر نقل کرتے ہیں۔

ع چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
صحبت رنداں سے واجب ہے حذر جائے سے اپنے کو کھینچا چاہیے

آپ نے دیکھا کہ مرزا کی مشکل پسندی کی حدود سہل پسندی تک آگئیں اور یہاں دیکھیے۔

ع ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہو گا اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

مرزا نے آسان پسندی کی انتہا کر دی اور اگر ابھی کچھ شبہ اور باقی ہے تو:

ع نہ سنو گر برا کہے کوئی نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک دو گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی

ہمیں امید ہے کہ ہمارے بیان کی صداقت کے لیے یہ مثالیں کافی ہیں اور قارئین کو بھی اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ مرزا کی اخلاقی شاعری کیسی بلند مرتبہ اور پاکیزہ ہے۔ اب ہم چند ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جس سے مرزا کی خودداری کا پتہ چلے اور لوگوں کو معلوم ہو کہ مرزا عام شاعروں کی مانند نہیں جو مادی منافع کی خاطر اپنے اصولوں کی پرواہ نہیں کرتے اور بے جا تعریف کرتے ہیں۔

خودداری:

علامہ اقبال جاوید کے نام اپنی مشہور نظم میں یوں لکھتے ہیں۔

ع اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کا احساں
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

مرزا غالب کا اسی موضوع پر ایک مشہور و معروف شعر ہے۔

ع اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

دیکھا جائے تو مرزا غالب کی نظر میں بھی وہی جذبہ کارفرما تھا جو اقبال کی نظر میں ہے۔ مگر اقبال کی نظر شیشہ گران فرنگ پر پڑی کیونکہ اس وقت کے سیاسی حالات نے مسلمانوں میں انگریز کے خلاف ایک بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ برخلاف اس کے مرزا کے دماغ میں یہ ہے کہ اپنی خراب سے خراب چیز دوسرے کی اعلیٰ سے اعلیٰ چیز سے بدرجہ بہتر ہے۔ خواہ وہ جام جم ہی کیوں نہ ہو۔ پس مضمون کے اعتبار سے غالب کا شعر اقبال کے شعر سے کہیں بلند ہے۔ دوسری چیز جس نے غالب کا مرتبہ اور بلند کر دیا وہ تخیل ہے۔ مرزا کی قوت تخیل وہاں تک پہنچی جہاں تک اس سے پہلے کسی کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ برعکس اس کے اقبال کا مضمون نہایت سیدھا سادھا ہے۔ ایک اور جگہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

ع اے طائر لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

ڈاکٹر اقبال نے خودداری کی تلقین جس خوبصورت پیرایہ میں نبھائی ہے وہ تعریف سے باہر ہے۔ اس موضوع پر کچھ کہنا نہایت مشکل ہے مگر دیکھئے مرزا غالب نے کس انداز سے خودداری کی تلقین کی ہے۔

درد منت کش دوا نہ ہوا　　میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

جس طرح اقبال نے احسان کے رزق سے موت کو ترجیح دی ہے۔ بالکل اسی طرح غالب نے احسان کی دوا سے موت کو ترجیح دی ہے۔ مگر غالب کی طرز بیان میں ایک اچھوتا پن موجود ہے۔ جس کا احاطہ مذاق سلیم ہی کر سکتا ہے پہلے مصرع میں درد اور دوا کا تعلق دوسرے میں اچھے اور برے کا تعلق ایسے خوبصورت انداز میں باندھا گیا ہے کہ اس سے بہتر کوئی اور ترکیب دماغ میں نہیں آتی۔ اسی طرح مرزا کے ہاں عشقیہ مضامین ہوں یا مذہبی یا اخلاقی کسی صورت میں بھی خودداری کا پہلو دبا ہوا نہیں۔ اس موقع پر ہم ان کے کلام کی چند عام مثالیں پیش کرتے ہیں جس سے مقصود یہ ہے کہ سامعین کو معلوم ہو جائے کہ وہ عشقیہ شاعری میں بھی خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کو پوجنا
چھوڑے نہ خلق کو مجھے کافر کہے بغیر

ہوں تیرے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ ابھی
گوش منت کش گلبانگ تلی نہ ہوا

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا

ان تمام اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ مرزا غالب اپنی خودداری کوکسی قیمت پر بھی بیچنے کو تیار نہیں خواہ اس میں ان کا مقابل محبوب ہی کیوں نہ ہو۔اب ہم چند ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جن کی بنیاد اخلاقیات پر ہے دیکھیے مرزا کی بہترین خودداری کی مثال۔

دیوار بار منت مزدور سے ہے خم

اے خانماں خراب نہ احساں اٹھایئے

جی ہی میں کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم

سر جائے یار سے نہ رہیں پر کہے بغیر

ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اور مثالیں نقل کی جائیں۔اس قسم کی مثالیں ہمیں مرزا کے کلام میں جا بجا ملتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے مضمون کے ابتدائی حصہ میں اس بات پر زور دیا ہے کہ مرزا کو عشقیہ شاعر کہنا ٹھیک نہیں۔ کیونکہ مرزا کے ہاں مذہب، اخلاق، خودداری، طنز، عشق، تخیل، تصویر کشی، جذبات نگاری، نزاکت، تشبیہات، استعارات، فصاحت و بلاغت کی جا بجا بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ ہمارا موضوع اجازت نہیں دیتا ورنہ ہم ان تمام عنوانات پر تفصیلاً بحث کرتے اور ثبوت کے لیے مرزا کا کلام پیش کرتے۔ جہاں تک مرزا کی فارسی شاعری کا تعلق ہے تو یہ حقیقت ہے کہ ان کا فارسی کلام اُردو سے کہیں بہتر ہے۔ان کے فارسی کلام میں مذہب اور اخلاق رہے ہیں۔لہٰذا ان کے فارسی کلام میں مذہب اور اخلاق کے ایسے نادر نمونے ملتے ہیں جو زبان فارسی کے لیے باعث فخر ہیں لیکن ہم چونکہ مرزا کی اُردو شاعری سے بحث کر رہے ہیں۔لہٰذا ان کے فارسی کلام پر کوئی رائے دینا مناسب نہیں۔ مرزا کا اُردو دیوان جسے کوئی فخر یہ انداز سے نہیں دیکھتے تھے۔تعجب ہے کہ ان کی پوری شہرت کا باعث یہی واحد دیوان ہے۔ جہاں تک ہمارے مطالعہ کا تعلق ہے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مرزا کی سب سے بڑی خوبی ایک یہ ہے کہ ان کے کلام کا کوئی حصہ بھی پست نہیں برخلاف اس کے۔ میر، مومن، ذوق اور دیگر شعراء کا حال یہ ہے

کہ ایک غزل نہایت استادانہ اور دوسری اس کے مقابلہ میں کمتر اور گری ہوئی ہے۔ میر تقی میر جو امام الغزل کہلائے جاتے ہیں اگر ان کی شاعری کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ پچاسوں غزلوں میں سے ایک آدھ شعر کام کا ہے۔ رہا تخیل کا سوال، سو تمام نقادان سخن اس بات پر متفق ہیں کہ تخیل میں مرزا کا رتبہ سب سے بلند ہے۔ پس اس سے مراد ہماری صرف یہ ہے کہ مرزا صف اول کے شعراء میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ مرزا پر جتنی تصانیف لکھی گئی ہیں مثلاً یادگار حالی، غالب اڈ لطیف، غالب نامہ میں ان کی اصلاحی شاعری پر کسی نے کچھ نہیں لکھا۔ البتہ ''یادگار'' میں کہیں کہیں اور صحیفہ ادب از منشی طارق میں اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کتاب کی صورت میں اس موضوع پر کچھ لکھا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مرزا غالب کے کلام کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرزا کے ہاں زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ جس پر کچھ نہ کہا گیا ہو اور فصاحت و بلاغت کی کوئی مشق ایسی نہیں کہ جس کی بہترین مثالیں مرزا کے دیوان میں نہ ملتی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہند کی غلامانہ خاک سے ایسے ایسے صاحب قلم پیدا ہو سکتے ہیں تو شیکسپیئر اور ملٹن ہماری نظر میں ہیچ نظر آتے ہیں۔

محمد اشرف

خطوط غالبؔ اُدب کا سرمایہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا غالبؔ ایک بہت بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ نثر نگار بھی تھے۔ انہیں اُردو نثر میں جو مقام اور شہرت حاصل ہوئی اس میں بڑا ہاتھ اُن کے خطوط کا ہے۔ جو انہوں نے مختلف دوستوں کو لکھے اُن کے خطوط کو ادبیات میں نہایت اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ مکتوب نگاری غالبؔ کی فطرت معلوم ہوتے اور اس کا اظہار انہوں نے اپنے کلام میں بھی کیا ہے ۔

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا

غالبؔ کے زمانے میں اُردو نثر لکھنا مستحسن نہ سمجھا جاتا تھا تمام تحریری کام حتیٰ کہ خطوط نگاری بھی فارسی زبان میں ہوئی تھی۔ اس وقت اگر کچھ اردو تحریریں تھیں تو وہ آٹے میں نمک کے برابر تھیں مرزا غالبؔ نے ماحول سے متاثر ہو کر فارسی زبان میں بھی نثر لکھی مگر زیادہ توجہ اُردو زبان کی طرف دی، گویا غالب کے خطوط اُردو ادب کے فروغ کی ایک کڑی بن گئے یہ خطوط اُردو ادب کا بیش بہا خزانہ ہیں اور کسی کتاب سے مرزا غالبؔ کی ۲۷ سالوں کی کوششوں، مصیبتوں اور ان کے ماحول کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا جتنا اُن کے خطوط کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ انہوں نے ۱۸۲۵ء میں فارسی میں ایک مختصر سا رسالہ مکتوب نویسی کے متعلق لکھا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شروع سے اس بات کے قائل تھے کہ خطوط میں جہاں تک ہو سکے بول چال کی زبان استعمال کی جائے اور تحریر میں تقریر کا لطف پیدا کیا جائے۔ انہوں نے اُردو خطوط میں جدت طرازی کو اپنایا۔ انہوں نے صحیح معنوں میں خطوط نویسی کو مکالمہ نویسی کا روپ دے دیا وہ خود لکھتے ہیں کہ:

"میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو
مکالمہ بنا دیا ہے ہزار کوس سے بزبانِ قلم ایک
دوسرے سے باتیں کیا کرو اور ہجر میں وصال کے
مزے لیا کرو"۔

ان کے بہت سے خطوط بالکل مکالمے کے انداز پر لکھے ہوئے ہیں۔ یہ حد درجہ دلچسپ ہیں۔ ایسے خطوط میں انہوں نے اکثر القاب و آداب قطعی ترک کر دیے ہیں ان میں بالکل ڈرامائی انداز پایا جاتا ہے مثلاً میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

"میاں صاحب! کیوں یار کیا کہتے ہو نور چشم
میر مہدی! آیئے جناب میر مہدی صاحب دہلی بہت
دنوں میں آئے کہاں تھے"۔

اُردو نثر کے رخ کو موڑنے میں خطوط غالبؔ کا اہم حصہ ہے حالانکہ ان خطوط کے شائع میں لکھی ہوئی کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ لیکن انہوں نے زمانہ کے عام مذاق پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا لیکن غالبؔ کے خطوط کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے نہ صرف اس زمانے کے عام مذاق کو بہت حد تک متاثر کیا بلکہ اُن کے خطوط کی اشاعت سے سر سیّد، نذیر احمد اور حاؔلی کی تصانیف کو جلدِ منظر عام پر آنے میں مدد ملی۔ مرزا کے اُردو خطوط کی سوانحی، اہمیت کو سب جانتے ہیں۔ لیکن سوائے ان خطوط کے جان میں انہوں نے اپنے واقعاتِ زندگی مختصراً دہرائے ہیں ان میں نو دس سال سے زیادہ کے واقعات بیان نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے فارسی خطوط کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے جو ان کی عمر کے ایک بڑے حصے کی کم وبیش ایک مکمل تاریخ ہے۔

اس شخصی اہمیت کے علاوہ مرزا صاحب کے فارسی خطوط اس لیے بھی دلچسپ ہیں اور اہم ہیں کہ ان کے مطالعہ سے اس زمانے کی کئی ممتاز ہستیوں سے شناسائی حاصل ہوتی

ہے۔ کیونکہ غالبؔ کا حلقہ احباب تعجب انگیز حد تک وسیع تھا۔ جن لوگوں کے نام انہوں نے خطوط یادگار چھوڑے ہیں، ان کی فہرست بہت پرشکوہ ہے اور اس میں اسی زمانے کے اکثر برگزیدہ ہستیوں کے اسمائے گرامی آ جاتے ہیں چنانچہ شعرا میں ناسخؔ، مومنؔ، شیفتہؔ وغیرہ علماء میں مولانا فضل حقؒ، مولانا صدرالدینؒ، قاضی القضات مولانا ولایت حسینؒ اور اکابر میں شہزادہ بشیرالدین میوری حکیم احسن اللہ خانؒ، مجتہد العصر مولوی سیّد محمدؒ وغیرہ ان سب کے نام غالبؔ کے دوستانہ خطوط موجود ہیں جن سے نہ صرف ان کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ انیسویں صدی کے آغاز میں شمالی ہندوستان میں جو بڑی بڑی ہستیاں تھیں ان سے بھی تعارف ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں زمانے کے عام حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً انہوں نے اپنے سفرِ بنگال کی جو صعوبتیں بیان کی ہیں ان سے اس زمانے کے وسائل آمد و رفت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے یا جو خط انہوں نے لکھنؤ سے روانگی کے وقت لکھا اس میں لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کی ان مصیبتوں کی تفصیل ہے جو انہیں معتمد الدولہ کی نیابت میں برداشت کرنا پڑیں انہوں نے غدر کے واقعات کو بھی اپنے خطوط میں جگہ دی۔ مثلاً ایک خط میں نواب انوارالدولہ کو لکھتے ہیں کہ:

> ''حضرت احترامِ مساکن و مساجد کا میں کیسا حال گزارش کروں، باقی شہر کو وہ اہتمام مکانات کے ہٹانے میں نہ ہوگا جواب والیان ملک کو ڈھانے میں ہے اللہ اللہ قلعہ میں اکثر اور شہر میں بعض بعض وہ شاہجہانی عمارتیں ڈھائی گئی ہیں کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں بلکہ قلعہ میں تو ان آلات سے کام نہ نکلا تو سرنگیں کھودی گئیں اور بارود بچھائی گئی اور مکانات سنگین اڑا دیے گئے''۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالبؔ اپنے خطوط میں ارد گرد کے ماحول کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

ان کے بہت سے خطوط ایسے ہیں جن میں انہوں نے کسی کے استفسارات کا جواب دیا ہے اسی قسم کے بیشتر خطوط صنفِ زبان سے عاری ہیں مگر ان کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلّم ہے۔ ان میں ایسے ایسے ادبی نکتے ہیں جن سے ہم غالبؔ کی علمیّت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مرزا غالبؔ کے وہ خطوط بہت اہم ہیں جو انہوں نے اپنے بے تکلف دوستوں یا عزیز شاگردوں کو لکھے جن سے وہ اپنی کمزوری تک نہیں چھپاتے تھے، جن کے سامنے وہ اپنا دل و دماغ کھول کر بیان کر دیتے تھے انہوں نے اپنے خطوط میں سادگی سے کام لیا۔ ڈاکٹر عبدالحق نے ایک جگہ ایک ادیب کا قول نقل کیا ہے کہ ''ایک جاہل اور ایک باکمال ادیب میں صرف ایک چیز مشترک ہوتی ہے اور وہ سادگی ہے لیکن دونوں کی سادگی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے''۔ غالبؔ کی سادگی بھی ان مکتوب نویسوں کی سادگی سے مختلف ہے۔ ان کی سادگی میں پرکاری پائی جاتی ہے۔ یہ صحیح معنوں میں سہل ممتنع ہے۔ گویا مرزا غالبؔ نے ہی سادگی کو اُردو نثر میں داخل کر کے ادب میں ایک نئی راہ پیدا کر لی۔

انہوں نے خطوط نگاری میں مزاح کے عنصر کو شامل کر کے اس بات کی گنجائش پیدا کر دی ہے کہ خطوط میں مزاح کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔ ان کے خطوط میں ایک ادبی شان پائی جاتی ہے۔ وہ خطوط میں چھیڑ چھاڑ، فقرے بازی اور چھوٹے چھوٹے لطائف و واقعات سے مزاح پیدا کر کے مکتوب الیہ کے لیے خط دلچسپ اور خوشگوار بنا دیتے ہیں۔ وہ کبھی تو لفظی الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرتے ہیں اور کبھی واقعات سے، انہوں نے اپنے خطوط میں شوخی و ظرافت سے بھی خوب کام لیا ہے، وہ اپنے کسی غمگین دوست کو خط لکھتے وقت بھی اپنی زندہ دلی کا دامن نہیں چھوڑتے، وہ غم کے موقع پر بھی ہنستے ہیں۔ اس لیے حالیؔ نے ان کو ''حیوانِ ظریف'' کہا ہے۔ ان کے خطوط اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ وہ غم میں غم نہیں بلکہ خوشی پیدا کرتے ہیں ایک دفعہ ایک لڑکے نے مرزا غالبؔ کو داد جان لکھ دیا آپ نے جواب میں لکھا ''میں تمہارا دلدادہ ہوں دادا نہیں ہوں۔ اُن کے خطوط نے نہ صرف اُردو نثر کی خدمت کی بلکہ شعر و سخن کی گتھیوں کو سلجھایا۔

انہوں نے اپنے خطوط میں اپنے بہت سے اشعار کی تشریح کی ہے ان کے کئی اشعار تو ایسے ہیں کہ ان کا مطلب ہی ان کے خطوط کے سیاق وسباق کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے گویا غالبؔ کے کلام کو سمجھنے کے لیے غالبؔ کے خطوط کا پڑھنا ضروری اور اہم ہے۔ ان کے خطوط کا پہلا مجموعہ جو ان کی زندگی میں چھپا اُس کا نام ''عُود ہندی'' ہے جس کے بارے میں قلق میرٹھی نے کہا ہے کہ جب طالبانِ زبان اس تحریر کو ملاحظہ فرمائیں گے تو دلی کا روزمرّہ اردو محاورہ گفتگو گھر بیٹھے سیکھ جائیں گے۔ تبارک اللہ کیا بے ساختہ عبارت ہے کہ نثر میں نظم کا مزہ آتا ہے اور ہر جملہ فقرہ معشوق کو شرماتا ہے''۔

ان کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ''اردوئے معلیٰ'' کے نام سے مشہور ہوا جو ان کی وفات کے بعد چھپا جس کے بارے میں ارشد گورگانی فرماتے ہیں کہ اقسام اُردو میں اوّل نمبر پر ''اُردوسے معلّٰی'' ہے جو سلاست اور وضاحت سے مجلّٰہ اور زبان دہلی کا اصل فوٹو ہے''۔ ان کے علاوہ مکاتیب غالبؔ اور خطوطِ غالبؔ وغیرہ ہمارے اُردو ادب کا ایک اہم حصہ ہیں۔

غالب کے خطوط کو لکھے ایک زمانہ ہو چکا ہے اس طویل مدت میں اُردو زبان نے بڑی ترقی کی ہے بڑے بڑے اہل قلم نے اپنے نتائج طبع سے اس زبان کو مالا مال کیا ہے اور آج اردو زبان میں اتنی وسعت اور لچک پیدا ہو گئی ہے کہ ہر طرح کے خیالات اور علمی مضامین آسانی سے اس زبان میں ادا کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن زبان وادب کے اتنے عروج پر پہنچ جانے کے باوجود یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ غالب جیسا انشا پرداز جو زندگی کے معمولی واقعات کو اس خوبی اور صفائی سے بیان کرے کہ ان میں افسانے کی دلچسپی اور عاشقانہ اشعار کی دلآویزی نظر آنے لگے آج تک پیدا نہیں ہوا ان کے خطوط دوسرے ادباؑ کے خطوط سے اس طرح مختلف ہیں کہ اُن کا صحیح طور پر موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

اُن کے خطوط آج بھی وہی دلآویزی، تازگی، شگفتگی اور مقبولیت رکھتے ہیں جو ان میں آج سے ایک سو سال پہلے تھی ان کے خطوط آسمان نثر کے جگمگاتے ہوئے ستارے ہیں۔ ان کے خطوط لازوال ہیں اور ان سے ہر دور میں رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ضرورت اس

امر کی ہے کہ ان کے اس قیمتی سرمایہ سے بھرپور فائدہ اٹھا کر اردو ادب کو صحیح طور پر سمجھا جائے اور اس کی خدمت کی جائے۔

از طلعت اقبال

ہائے فزکس

واسطے فزکس کے رکھتے ہیں ہم جذبات خیر
پھر بھی اللہ واسطے کا ہم سے ہے کیوں اس کو بیر
ویوز آسیلشنز اور سائی فائی کا سب پھیر
ان سے تو اچھے ہیں یارو غالبؔ و مومنؔ کے شاعر
نو میریکل، تجربے اور تھیوری.......... الامان
کیسی کیسی آفتیں ہیں اور یہ ننھی سی جان
کرکٹ و فٹ بال چھوٹی چھوٹا صدیوں کا شمار
تھرموڈنمکس کو دیکھا تو ہو گئے اشک بار
گر نہ پیدا ہوتا نیوٹن یارو کرتے عیش سب
ہم بھی کچھ معلوم کرتے کیا تھے رانجھا قیس سب

محمد عبداللہ

غالب کی اُردو نثر

(یہ مضمون 'بزم اُردو' ایس۔ای۔کالج بہاول پور کے ایک غیر معمولی اجلاس میں پڑھا گیا تھا اور نظر ثانی کے بعد کالج میگزین کے لیے پیش کیا جا رہا ہے)۔ (محمد عبداللہ)

تاریخ ادب اور خاص طور پر اردو ادب میں یہ خصوصیت بہت ہی کم لوگوں کو حاصل ہے کہ وہ ایک سے زیادہ زبانوں میں کلام موزوں کر سکیں۔ اور دو مختلف اصناف سخن کے ہیرو تو ہمیں مشکل ہی سے نظر آتے ہیں۔ کوئی نظم کے میدان کا شہسوار ہے تو کوئی نثر میں اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ لیکن ان دونوں خصوصیتوں کا کسی ایک شخصیت میں جمع ہونا اس شخصیت کی عظمت اور غیر معمولی قابلیت کی دلیل ہے۔

اس حیثیت سے جب ہم غالب پر نظر ڈالتے ہیں تو نہ صرف ہم انہیں اُردو اور فارسی کا بلند پایہ شاعر پاتے ہیں بلکہ اُردو نثر کے میدان میں بھی وہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اگر ہم انہیں جدید اُردو نثر کا باوا آدم کہیں تو بجا ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے اُردو نثر میں اس عظیم عمارت کی بنیاد رکھی جس کی تکمیل بعد کو چل کر سرسید اور ان کے رفقائے کار کے ہاتھوں ہوئی۔

غالب فطرتاً جدت پسند تھے۔ تقلید کا مادہ ان میں مفقود ہے اور یہ خصوصیت ان کے یہاں زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتی ہے۔ جس طرح ان کی نظم دوسرے شاعروں سے بالکل مختلف ہے اسی طرح ان کی نثر بھی چند منفرد خصوصیت کی حامل ہے۔

اُردو نثر کی تاریخ اس وقت تک تشنۂ تکمیل رہے گی جب تک غالب کی اُردو نثر کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ غالب کا سرمایہ نثر ان کے وہ سینکڑوں خطوط ہیں جو انہوں نے اپنے شاگردوں، عزیزوں اور دوستوں کے نام لکھے۔ یہ مجموعے اب تک مختلف ناموں سے کئی

بار چھپ چکے ہیں۔ غالب زیادہ تر فارسی کی طرف مائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اُردو کلام کو فارسی کے مقابلہ میں ''مجموعہ بے رنگ'' کا خطاب دیتے ہیں۔ وہ اُردو کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ ان کا اصلی جوہر ان کے فارسی کلام میں کھلتا ہے۔ لیکن بقول حالی انسان جس چیز کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا بعض دفعہ آگے چل کر وہ اس کی شہرت و ناموری کا باعث بنتی ہے۔ یہی حال غالب کی اُردو نظم و نثر کا ہے۔

غالب نے نہ صرف شاعری کی ابتدا فارسی سے کی بلکہ خط و کتابت کے لیے بھی پہلے پہل فارسی ہی کو اختیار کیا۔ کہتے ہیں جب مرزا خاندان مغلیہ کی تاریخ 'مہر نیمروز' اور 'ماہ نیم ماہ' مرتب کرنے میں مصروف تھے تو انہیں خط و کتابت کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا۔ چنانچہ وہ وقت کی قلت کے پیش نظر فارسی کے بجائے اُردو میں خط لکھنے لگے گویا ان کا ایسا کرنا ضرورت کے ماتحت تھا اور اس سے ان کا مقصد کوئی خاص ادبی تخلیق نہ تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو صاف ظاہر ہے کہ جو چیز 'ادبی تخلیق' کے تصور سے لکھی جاتی وہ کس قدر بلند ہوتی۔

جیسا کہ ہم اشارۃً اوپر کہہ آئے ہیں۔ غالب کو جدید اُردو نثر کے بانیوں میں شمار کرنا چاہیے۔ انہوں نے اُردو نثر میں ایک ایسے طرز تحریر کی بنا ڈالی جو اس سے پہلے ہمیں کہیں نظر نہیں آتی۔ انہوں نے خطوں کے پرانے لمبے چوڑے القاب و اداب اور مقفّی مسجع عبارت کو ترک کر کے اس کی جگہ صاف اور سلیس اُردو کی بنیاد ڈالی۔ وہ اپنے خطوط کو بالکل اس طرح ''بھائی میاں'' اور ''صاحب'' وغیرہ کے الفاظ سے شروع کرتے ہیں جس طرح دو شخص آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انہیں پہلے سے اُردو نثر کے آئندہ رجحانات کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔

غالب کے خطوط کی نمایاں خصوصیات ان کی سادگی، بے تکلفی اور بے ساختہ پن ہے۔ ان میں تصنع نام کو نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ سے باتیں کر رہے ہیں۔

چونکہ انہیں اس طرح کے القاب پسند نہیں تھے اس لیے نفس مطلب زبان قلم پر لے آتے ہیں۔ ان کے خطوط میں کہیں کہیں ظرافت کی ہلکی سی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ غالب کے خطوط ان کی زندگی کا مرقع ہیں۔ اصلی غالب (Ghalib as a man) کو دیکھنا چاہو تو ان کے خطوط کا مطالعہ کرو۔ کیونکہ ان کے دیوان میں 'شاعر غالب' 'انسان غالب' پر حاوی ہے۔ اس لیے نظم کے ذریعہ ان کی زندگی کی صحیح تصویر ہمارے سامنے نہیں آتی۔ ہم ذیل میں غالب کے چند خطوط کے اقتباسات نقل کرتے ہیں تاکہ آپ خود اس کی خوبیوں کا اندازہ لگا سکیں۔

میرزا ہرگوپال تفتہ کے نام (جو غالب کے نہایت عزیز شاگرد تھے) ایک خط ملاحظہ فرمایئے۔

''آؤ میرزا تفتہ گلے لگ جاؤ، بیٹھو اور میری حقیقت سنو۔ یک شنبہ کو مولوی مظہر الحق آئے تھے۔ ان سے سب حال معلوم ہوا۔ پہلا خط تم کو ان کے بھائی مولوی انوار الحق نے بموجب حکم انگسٹن صاحب لکھا تھا۔ پھر صاحب نے ایک خط مسودہ کر کے اپنی طرف سے تم کو لکھا'' آگے چل کر اسی خط میں لکھتے ہیں''........................اور بھائی تمہاری مشق چشم بدور صاف ہوگئی۔ رطب ویابس تمہارے کلام میں نہیں رہا اور اگر خواہی نہ خواہی تمہارا عقیدہ یہی ہے کہ اصلاح ضرور ہے تو میری جان میرے بعد کیا کرو گے ؟ میں چراغ دم صبح وآفتاب سرکوہ ہوں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ۱۴ رجب نجات کا طالب غالب۔''

میری مہدی کے نام ایک خط کی صرف چند ابتدائی سطور ملاحظہ فرمایئے:

''میاں لڑکے کہاں پھر رہے ہو؟ ادھر آؤ خبریں سنو، دربار لاٹ صاحب کا میرٹھ میں دلی کے جاگیردار بموجب حکم کمشنر دہلی میرٹھ گئے۔ موافق دستور قدیم مل آئے۔ غرضیکہ پنج شنبہ ۲۹ دسمبر کو پھر دن چڑھے لاٹ صاحب یہاں پہنچے''۔

ایک اور خط کی ابتدا یوں کرتے ہیں: ''............ آ ہا ہا ہا میرا پیارا مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو یہ رام پور ہے۔ دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔ پانی سبحان اللہ، شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے' کوسی' اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمہ آب حیات کی کوئی سوت آس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی ہے، تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے۔ لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔ تمہارا خط پہنچا۔ تردد عبث۔ میرا مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست، نہ عرف لکھنے کی حاجت نہ محلے کی حاجت، بے وسواس خط بھیج دیا کیجئے اور جواب لیا کیجئے''۔

میری مہدی کو غدر کے بعد ایک خط رقم طراز ہیں ''............ اے میرے مہدی تجھے شرم نہیں آتی، میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے۔ ارے اب اہل دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں، تو کسی کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟''۔

یوسف مرزا کے نام غالب کے ایک تعزیت نامہ کی چند ابتدائی سطریں ملاحظہ ہوں:

''وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا۔ ہرگز غم نہ کرو۔ اگر ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ اولاد بہت، نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ وہ اپنی اجل سے میرے، بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے''۔

میرزا علاؤ الدین احمد کے نام خط کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا لکھتے ہیں:

''صبح یک شنبہ ۲۷ جولائی ۱۸۶۴ء میری جان سن پنج شنبہ آٹھ، جمعہ نو، ہفتہ دس، اتوار گیارہ، یک مژہ برہم زدن مہینہ نہیں تھما۔ اس وقت شدت سے برس رہا ہے۔ انگیٹھی میں کوئلے پاس رکھ لیے ہیں۔ دو سطریں لکھیں اور کاغذ کو آگے سے سینک لیا۔ کیا کروں تمہارے خط کا جواب، لو سنتے جاؤ مرزا شمشاد علی بیگ کو تمہارا خط پڑھوایا۔ انہوں نے کہا

غلام حسن خاں کی معیشت پر کیا موقوف ہے، مجھے آج سواری مل جائے کل چل نکلوں۔ اب میں کہتا ہوں کہ اونٹ ٹنو کا موسم نہیں۔ گاڑی کی تدبیر ہو جائے۔ بس پچاس برس کی بات ہے الٰہی بخش مرحوم نے ایک نئی زمین نکالی میں نے حسب الحکم غزل لکھی بیت الغزل یہ ہے:

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع ہے: اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کے مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی الو کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ شاعر متوفی کا کلام مطربوں کر دیا ہو''۔

غرضیکہ یہ خطوط نہ صرف غالب کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ انہوں نے اردو نثر میں ایک ایسے انداز تحریر کی بنیاد رکھی جس کی تقلید ناممکن ہے۔

کفور مہر الٰہی

اُردو شاعری کا رجحان (ولی سے لے کر غالب تک)

اُردو شاعری کی ارتقائی تاریخ پر اگر ہم ایک نظر ڈالیں تو ہم اسے واضح طور پر دو ادوار میں منقسم پاتے ہیں۔ اس کا دور اولین ولی دکنی سے لے کر غالب تک اور ثانوی دور مولانا حالی سے لے کر زمانہ حال تک ہے۔

یہاں صرف پہلے دور پر ہی ایک نظر ڈالی جائے گی۔ یہ قانون قدرت ہے کہ یہاں جو چیز عالم وجود میں آتی ہے وہ اپنے آپ کو اپنے ماحول کے سانچے میں ڈھال لیتی ہے اور اس پر گرد و پیش کا رنگ غالب آ جاتا ہے۔ اُردو شاعری پر بھی یہی ماجرا گزرا جب اس نے سرزمین ہند میں آنکھ کھولی تو یہاں فارسی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ بادشاہان وقت، امرا اور عوام الناس، سعدی شیرازی، حافظ، نظیری اور امیر خسرو کے کلام کے دلدادہ تھے۔

فارسی شاعری فسانہ ہائے ہجر و وصال جھوٹے تصوف اور مبالغہ آرائی سے اَٹی پڑی تھی اور شعرائے وقت حسن معانی سے زیادہ صنائع بدائع، حسین تراکیب اور نادر استعارات پر زور دیتے تھے۔ علاوہ ازیں اس زمانہ کے سیاسی حالات بہت ناگفتہ بہ تھے۔ چہار طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور اس کی جگہ سامراجی اور استعماری قوتیں آہستہ آہستہ اپنے پاؤں جما رہی تھیں۔ نفسیاتی طور پر اس وقت کے امرا، جاگیرداروں اور نام نہاد نوابوں اور راجوں کو اپنے گرد و پیش کے حالات کی موافقت کی ضرورت تھی۔ اس لیے لازماً ان کے ٹکڑوں پر پلنے والے شعرا کو ایسی شاعری پیدا کرنا تھی جو انہیں دنیا و مافیا سے بے خبر کر دے۔ جس میں قناعت اور زندگی

کے حقائق سے فرار کا درس ہو۔

لہٰذا نوزائیدہ اُردو شاعری پر ان باتوں کا اثر ہونا بعید از قیاس نہیں۔ اس طرح ہمیں اس دور کی بیشتر شاعری میں حسن و عشق، شراب و شاہد، گل و بلبل، رخسار و کاکل اور زندگی سے فرار کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اس زمانہ کی شاعری بہت محدود موضوعات کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ اگرچہ اس وقت کے شعراء کے گرد موضوعات کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ لیکن کسان کی پیشانی کے پسینے مزدور کے سرِ بازار بکتے ہوئے گوشت اور قوم کی ذلالت و گمراہی میں ان کے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ ان کی دنیا یہ ہماری تمہاری دنیا نہیں۔ یہاں سرراہ عصمتوں کا نیلام ہوتا اور محبتیں فاقہ کشی کی دہلیز پر دم توڑتی نظر آتی ہیں۔ بلکہ ان کی اپنی ایک خیالی دنیا تھی جہاں حد نظر تک گل و لالہ کھلے ہوئے ہیں۔ آب حیات کی نہریں بہہ رہی ہیں اور ان کے معشوق کی سیاہ سانپوں جیسی زلفیں۔ موہوم نقطہ کے برابر منہ اور صراحی دار گردن کسی انجانے خلا میں کھوئی ہوئی ہے اور شاعر صاحب اس کے فراق میں آہیں بھر رہے ہیں۔

غرضیکہ اس دور کی شاعری حقائق سے تہی، حسین الفاظ کا جال ہے جس میں ہر شاعر کا تخلیقی دماغ مقید نظر آتا ہے۔ یہ تو تھا اس دور کی اُردو شاعری کا بحیثیت مجموعی رجحان۔ اب ہم اس دور کی منتخب اصناف شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

غزل:

اس دور کی سب سے مقبول اور مروج صنف غزل ہے۔ اس میں ہمیں وہی فارسی والے فرسودہ خیالات اور تحت الشعور کی گتھی گتھی، جنسی الجھنیں ملتی ہیں جو اُردو غزل کا لبادہ اوڑھ کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اس پست ہمتی، فاقہ مستی اور بدامنی کے زمانہ میں یہ اُردو غزل ہی تھی جو سب سے پہلے آگے بڑھی اور اہل ہند کے نیم خوابیدہ احساس پر افیون کا عمل کر کے ان کو کلی طور پر معطل کر دیا۔ القصہ اس دور کی غزل صرف امراء اور

شرفاء کے ذہنی تعیش، تفریح طبع اور غیر صحت مندانہ جنسی جذبات کی آسودگی کا سامان تھی۔ لیکن اس دور کی غزل سراپا بے کار ہی نہیں بلکہ اس میں کارآمد جوہر بھی تھا اور یہاں ہمیں ارفع خیالات اور نئے تجربات بھی ملتے ہیں لیکن بے فائدہ اور فضول غزلیات کی فراوانی ہے۔ اُردو شاعری کا سب سے پہلا شاعر ولی دکنی ہے۔ اس کا طرز بیان دل نشیں، زبان سہل اور خیال نسبتاً پاکیزہ ہیں۔ ہندی الفاظ اور تراکیب کے برمحل استعمال نے اس کے کلام میں چاشنی پیدا کر دی ہے۔ اور بلحاظ شیرینی زبان اور سہل نگاری اس تک بہت کم شعراء پہنچتے ہیں۔

اس کے بعد میر تقی میر ہے جس نے اُردو غزل میں اپنے لے مقام پیدا کیا۔ میر کا کلام یاس وحزن اور سوز وگداز سے بھرپور ہے۔ اس کے ہر شعر سے قنوطیت ٹپکتی ہے۔ اس کا باعث طوفان بلا وحوادث ہے جس کے درمیان شاعر کو اپنی زندگی بسر کرنی پڑی اور اسے ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا جس میں کسی حساس دل کو قنوطی بنے بغیر چارہ کار نہیں تھا۔ اثر انگریزی میں اس کا کلام سب سے بڑھا ہوا ہے۔ کیونکہ اس کی شاعری واردات حقیقی پر مبنی ہے۔ یہ اس کا خون شدہ دل ہے جس کے قطرات اس نے ترتیب دے کر اشعار کے سانچے میں ڈاھل دیے۔ میر جب بہت رلا چکا تو چمنستان شاعری میں خزاں کے بعد بہار کی طرح جرأت وانشاء آئے اور انہوں نے غزلیات میں متانت اور سنجیدگی کی بجائے شوخی اور رنگینی بھر دی جس سے تماء محفلیں زعفران زار بن گئیں اور دلوں سے گرد الم کچھ کچھ چھٹ گئی۔ لیکن ان کے اشعار میں کراہتی ہوئی انسانیت کی آواز بلند بانگ قہقہوں میں سے جھنجھناتی ہوئی نظر آتی ہے۔

تصوف کا تحفہ اُردو شاعری میں فارسی سے آیا اور بہت سے شعراء نے اس میں مشق سخن کی۔ لیکن امیر مینائی اس سلسلہ میں سب سے افضل نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ سلسلہ امیر مینائی کے بعد جلد ہی دم توڑ گیا۔

اُردو غزل میں مرزا غالب کا مقام ہر ایک کے نزدیک مسلم ہے۔ اس جیسا غزل گو نہ تو اب تک پیدا ہوا ہے اور نہ مستقبل قریب میں اُمید ہے۔ اس نے اُردو شاعری کو عمیق گہرائیوں سے اوج ثریا اور فرش خاک سے عرش معلیٰ تک پہنچا دیا۔ اس نے عامیانہ فرسودہ خیالات کی بجائے فلسفیانہ خیالات اور معنی آفرینی کو غزل میں داخل کیا۔ پٹے ہوئے راستہ کو چھوڑ کر نئی راہ پر گامزن ہوا۔ ترقی کی طرف ہر نئے قدم پر اس کی مخالفت کی گئی اور یہی وجہ ہے کہ اپنے زمانہ میں میرزا کی صحیح طور پر قدر نہ ہو سکی لیکن وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کے کلام کے ذہنوں پر ثبت شدہ نقوش ہم پر بالکل واضح ہو گئے۔

اس کی شاعری اُردو غزل کے لیے ایک موڑ ثابت ہوئی اور بلندئ تخیل اور تنوع موضوعات جو پہلے بالکل عنقا تھا اب شاعری میں داخل ہونے لگا اور ظاہر بہت کو چھوڑ کر باطینت کی طرف دھیان دیا جانے لگا۔ اس کے بعد مولانا حالی نے میرزا کی پیروی میں نئی راہ اپنائی اور ایک قدم اور آگے بڑھ کر غزل کو قوم کی رہبری کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا اور اس پر دوسرے دور کے رجحان کی بنیاد پڑی۔

میرزا غالب کے زمانہ میں دلی لٹ چکی تھی۔ یہاں درباری سرکاری شعراء کے لیے کوئی سہارا نہیں تھا۔ اس لیے بیشتر شعراء نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ اس طرح میرزا غالب کے مقابلے میں آتش کا مکتبہ خیال قائم ہو گیا۔ لکھنؤ کے ماحول نے دہلی سے آئے ہوئے شعراء پر اثر کیا اور جب انہوں نے پھر وہی راگ رنگ، آزادانہ اختلاط اور جام و مینا کا بازار گرم دیکھا تو ان کی غزلیات میں دوبارہ سرود و نغمہ اور جنسی تشنج عود کر آیا۔

القصہ لکھنؤ کی شاعری میں اب بھی وہی رعایت لفظی، حسن ظاہری تصنع اور مبالغہ تھا۔ اس کے برعکس دلی کی شاعری میں حسن معانی اور لطیف موضوعات پر زور دیا جانے لگا۔

قصیدہ:

اُردو شاعری میں قصیدہ بھی فارسی سے آیا۔ اس لیے اس میں فارسی شعراء کا تتبع

کیا گیا۔ قصیدہ کسی بادشاہ یا امیر کی مدح اور اس کی برائیوں کو بھی خوبیوں کی حدود میں لاتا ہے۔ قصیدہ کا حسن زیادہ سے زیادہ حسین استعارات اور بندشوں کے استعمال میں مضمر ہے۔ ویسے تو اس دور میں بہت کم شعراء ہیں جنہوں نے قصائد نہ لکھے ہوں۔ لیکن اُردو میں فن قصیدہ گوئی کا پیغمبر میرزا رفیع سودا ہے جس نے قصائد کو معیاری بنایا اور اُردو شاعری میں اس صنعت کے لیے خاص مقام پیدا کیا۔

ہجو:

قصیدہ کے ساتھ ساتھ جس صنعت شاعری نے فروغ حاصل کیا وہ ہجو ہے۔ ہجو قصیدہ کے بالکل الٹ ہوتا ہے۔ یعنی اس میں کسی کی ذات میں خواہ مخواہ کیڑے نکالے جاتے ہیں۔ میرزا سودا نے سب سے پہلے اس فن کو اُردو میں رواج دیا اور کئی دفعہ تو اخلاق کی حدود وبھلا نگ گئے حتیٰ کہ گالی گلوچ اور فحاشی سے بھی گریز نہ کیا اس طرح سودا اور اس کے پیروکاروں نے اُردو شاعری میں گندگی کا اچھا خاصا ڈھیر جمع کیا۔ اگر ہجو کو تعمیری نکتہ چینی تک محدود رکھا جاتا تو یہ مفید ثابت ہوسکتی تھی۔ لیکن اسے ذاتیات اور بازاری پن کی سطح تک گرادیا گیا۔

مرثیہ گوئی:

مرثیہ گوئی نے امرائے لکھنؤ کی مجلسوں میں آنکھ کھولی اور وہیں کمال حاصل کیا۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بعد عربی اور فاسی میں بیسوں مرثیے لکھے جانے لگے۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے اس فن کو نقطہ عروج تک پہنچایا۔ اس کی وجہ سے اردو شاعری میں سلاست، روانی اور سادگی پیدا ہوگئی اور زندگی سے قدرے نزدیک آ گئی۔ اس زمانہ کے بیشتر مرثیے مسدس کی شکل میں ملتے ہیں۔ اگر چہ مرثیے اب بھی لکھے جاتے ہیں لیکن ان کا تعمیری دور انیس اور دبیر کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔

مثنوی:

اس صنف میں کسی قصہ کو منظوم شکل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔اس دور میں کئی مثنویاں لکھی گئیں۔جن میں سحر البیان اور زہر عشق بہت مشہور ہیں۔

اُردو شاعری اور مذہب:

اُردو شاعری سے اس دور میں اشاعت مذہب کا کام بھی لیا گیا۔خصوصاً دکن کے شعراء نے اس سلسلہ میں بہت سرگرمی دکھائی۔میران شاہ نے اُردو شاعری کو وسیع پیانہ پراشاعت مذہب اور اصلاح اخلاق کے لیے استعمال کیا۔

اُردو شاعری اور زندگی:

اگر چہ یہ دور زندگی سے فرار کا دور ہے اور روزمرہ کے عام مسائل کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے۔لیکن پھر بھی ہمیں چند شعراء ایسے مل جائیں گے جنہوں نے اسے زندگی کے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔لیکن یہ ماحول اس کے لیے ساز گار نہ تھا اس لیے جلد ہی انکا کلام زینت طاق نسیاں بن گیا۔اس سلسلے میں دکن کے محمد علی قلب شاہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سودا نے بھی اپنی مشہور نظم ''شہرآشوب'' میں اپنے زمانے کے حالات بیان کیے ہیں۔علاوہ ازیں نظیر اکبرآبادی نے اپنی شاعری، زندگی کے عام مسائل کے بیان میں وقف کردی اس لیے انہیں اپنے زمانہ میں کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔

آپ کو یہ گلہ ہے گردوں سے
موقع سلطنت نہیں ملتا
میں پریشاں ہوں اس لیے اکبر
گوشہ عافیت نہیں ملتا
(اکبرالٰہ آبادی مرحوم)

❀❀❀

محمد سلمان سید

یوم غالب کیوں؟

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں!

اور ظاہر ہے دنیا کا کاروبار تو چلتا رہتا ہے غالب کے بغیر بھی چلتا رہے گا۔۔۔۔۔

پھر غالب کون؟ اور یوم غالب کیوں؟ لوگ کہتے ہیں کہ غالب نے انسانیت پر کون سا احسان کیا ہے کہ اس کی یاد منائی جائے۔۔۔۔۔۔ جہاں دیکھو غالب! ابتدائی جماعتوں سے جو غالب شروع ہوتے ہیں تو آخیر تک غالب ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ معاشرے میں جہاں نظر ڈالو کہیں نہ کہیں کسی بہانے غالب ہمارے بیچ میں آدھمکتے ہیں۔۔۔۔۔۔

بات ہو رہی ہے زندگی کے مسائل کی، اپنے کاروبار کی، اپنی مشکلات کی ۔۔۔۔۔۔

ایک صاحب آہ بھرتے ہیں کہ ہائے غالب کیا فرما گئے ہیں کہ ۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

لیجئے صاحب! شعر کیا پڑھا کہ ہر شخص کو اپنی مشکلیں آسان ہوتی نظر آئیں۔۔۔

اب معلوم ہوا کہ غالب مرحوم ہمارے جذبوں کو زبان عطا کر کے ہمارے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں اور ہمارے اندر زندگی سے نبرد آزما ہونے کا جذبہ ایک بار پھر لوٹ آتا ہے۔۔۔۔

انسانی جذبوں کو اگر زبان نہ مل سکے تو انسان گھٹ کر مر جائے۔ شاعر یہی کرتا ہے کہ وہ شدائد حیات میں جذبات انسانی کو زبان عطا کر کے سکون ذہنی بہم پہنچاتا ہے۔۔۔۔ غالب نے اس فرض کو نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے۔۔۔۔۔۔

کیونکہ انہوں نے اس کے لیے الفاظ کا جادو جگایا ہے بلکہ الفاظ کے حسن انتخاب میں انہوں نے ایک ایک لفظ کو گنجینۂ معنی بنا دیا ہے۔ انسانی جذبات میں جذبے کے وہ وہ گوشے بے نقاب کیے جن پر اس سے پہلے کسی کی نظر بہت کم گئی یا اگر گئی تو اسے حسن الفاظ کا لبادہ نہ اوڑھا سکا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس پر جو سب سے بڑا احسان کیا ہے وہ یہ کہ اسے بیان کا علم دیا ہے۔

خلق الانسان علمہ البیان

حسن بیان کا یہ ملکہ جو شخص حاصل کر لیتا ہے گویا وہ اللہ کے اس احسان کا شکرادا کرتا ہے۔۔۔۔شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ دائمی اور کائناتی احسانات کو ایسا زبان عطا کرے کہ شعور انسانی وجد کرنے لگے۔۔۔۔۔۔غالب نے یہی کام کیا ہے۔۔۔۔

غالب کی سب سے بڑی خوبی میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ عظمتوں کا شاعر ہے۔۔۔۔۔عظمت آدم اس کے نزدیک سب سے مقدم ہے، وہ جب کہتے ہیں کہ ؎

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا میرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا میرے آگے

تو مظاہر قدرت عظمت انسانی کے ہاتھوں مسخر ہوتے نظر آتے ہیں۔

وہ عاشق بھی ہے تو ایسا کہ سبک سر بن کے محبوب سے پوچھنا گوارا نہیں کرتا کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو۔ غرض یہ کہ غالب اپنے اشعار میں زندگی سے اتنا قریب ہے کہ ہمیں اپنے دل کی دھڑکنیں اسے کے کلام میں سنائی دیتی ہیں۔۔۔۔ بلکہ ہم ہی کیا، اس کے کلمہ کی آفاقیت نے تو بین الاقوامی سطح پر انسانوں کو متاثر اور متوجہ کیا ہے۔۔۔۔جاپان سے امریکہ تک اور روس سے جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا تک ہر جگہ غالب کے کلام کو براہِ راست یا دوسری زبانوں کے زخموں کے ذریعے خوب سراہا جاتا ہے۔۔۔۔

غالب نے زندگی کیسے گزاری، اس کا اخلاق و کردار کیا تھا۔۔۔۔۔اس سے تھوڑی دیر قطع نظر کر لیجئے۔۔۔۔۔حضرت علی کے مطابق یہ نہ سوچئے کس نے کہا ہے یہ دیکھئے کہ کیا کہا ہے۔۔۔۔۔تو غالب ایک شخصیت نہیں، ہمارے جذبات کے اظہار کا نام ہے۔۔۔۔۔محبت کی علامت ہے۔۔۔۔۔اسی لیے ہم اس کی یاد مناتے ہیں۔